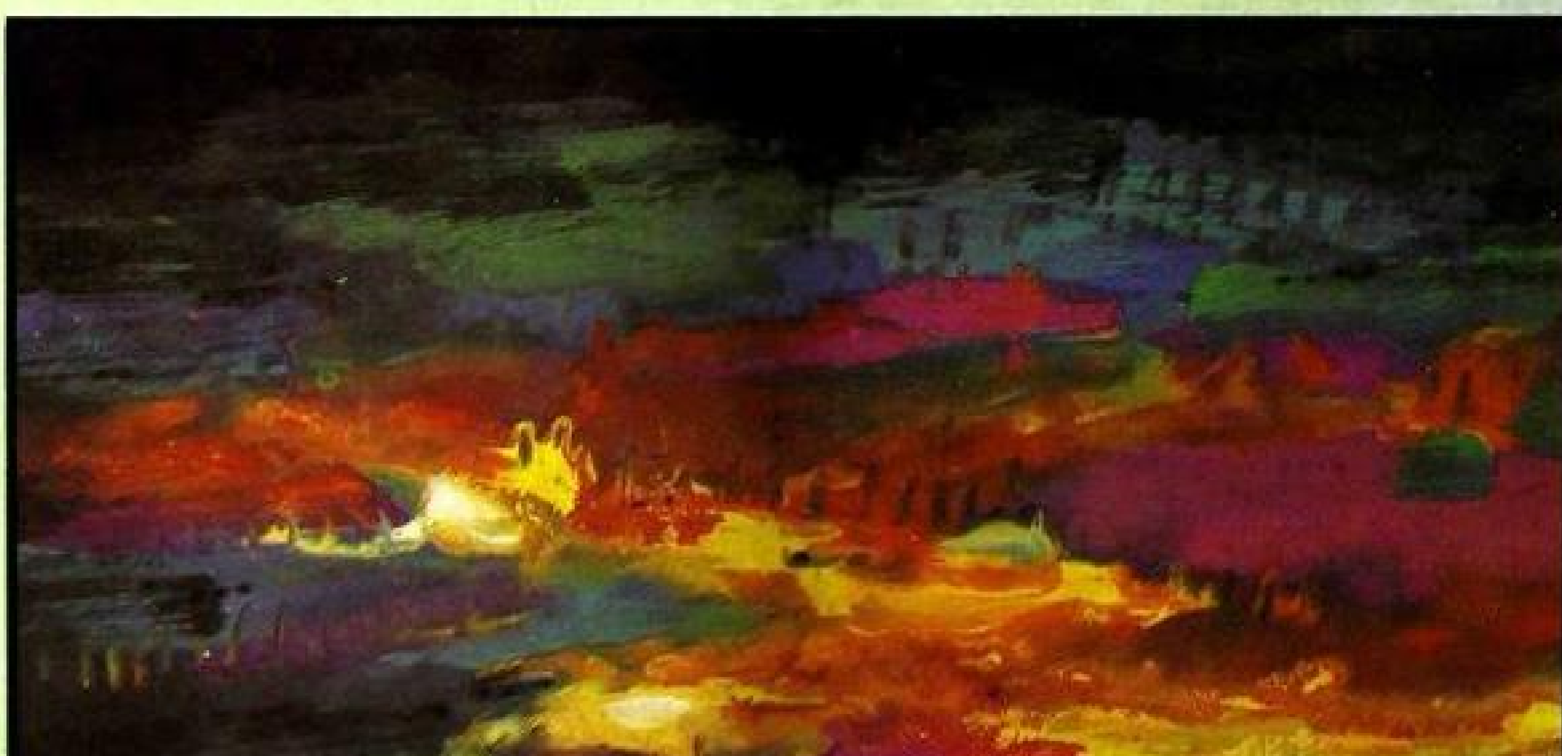
ہمارے ادبی، لسانی اور تعلیمی مسائل



سید محمد ابوالخیر کشفی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارے ادبی، لسانی اور تعلیمی مسائل

مضامین

سید محمد ابوالخیر کشفی

زین پبلی کیشنز، کراچی

ہمارے ادبی، لسانی اور تعلیمی مسائل

سید محمد ابوالخیر کشفی

سالِ اشاعت: ۲۰۰۶ء

سرورق: بشیر موجد

کمپوزنگ: طاہر قریشی، نئے افق پبلی کیشنز، فون: 2628014

پرنٹر: احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی

پبلشر: زین پبلی کیشنز، A-8، ندیم کارنر، بلاک: N، شمالی ناظم آباد، کراچی

فون: 6645177, 6679796

تقسیم کار: رائل بک کمپنی۔ بی جی ۵، ریکس سینٹر، فاطمہ جناح روڈ، کراچی

کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فضلی سنز، سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی

کتاب نما

(۱)

(۲)

(۳)

(۴)

قیمت: ۱۵۰/ روپے

احمد مرزا جمیل کے نام

جو مشرقی تہذیب اور آدابِ حیات کی تجسیم ہیں،
جن کی ذات اور کاموں میں حُسن اور سلیقے کی نمود ہے،
اور جن کے ''نوری نستعلیق'' نے اردو کو
عہدِ جدید کی رفتار عطا کر دی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ مجموعہ ادب، ادیبوں، تعلیم اور قومی زندگی سے متعلق میرے خطبات اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ ایسے موضوعات اور مضامین کو لوگ عام طور پر نظری مضامین کہتے ہیں۔ ہر ادیب ادب کی ماہیت، وظائف، معاشرے سے ادب کے تعلق کے بارے میں سوچتا ہے۔ ادیب اپنے معاشرے کا رکن ہوتا ہے، اسی لیے ایسے مضامین مختلف ادبی اجتماعات کے لیے لکھے گئے۔ ان میں سے بعض مضامین تو بلند آواز میں سوچ (Loud thinking) کی طرح ہیں۔

تدریس میرا پیشہ تھا اور ہے، کہ معلم کبھی ریٹائرڈ نہیں ہوتا۔ میں نے تعلیم کے بارے میں بھی سوچا اور سوچتا رہا، اور ادب پر بھی معلم کی حیثیت سے غور کیا۔ ادب پر سوچتے ہوئے ادیب اور معلم زبان کے مسائل سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ میں نے جدید لسانیات کی باضابطہ تعلیم حاصل کی ہے اور ارادہ ہے کہ انشاءاللہ لسانیات اور معاشرے کے تعلق پر ایک مختصر سی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

ان مضامین میں ادب، تعلیم، سیاست، ثقافت اور معاشرے کے دوسرے پہلوؤں کا ذکر بھی موجود ہے۔ ادب کسی بھی ثقافت یا معاشرے کا لبِ گفتار ہوتا ہے اسی لیے تہذیبی مسائل سے الجھنا ادیب کا وظیفہ ہے۔

پھر ہمارے معاشرے کے اجزائے ترکیبی دوسرے معاشروں سے مختلف ہیں۔ مذہب کو پاکستان کے تصور اور حقیقت میں اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام میری فکر کی اساس ہے اور مجھے اُس زمانے میں بھی اس پر اصرار تھا جب ترقی پسندوں میں میرا شمار تھا۔

آپ ان مضامین سے اتفاق کریں یا اختلاف ہمیں ا ر، یہ خوشی ہوگی اگر یہ آپ کو قابلِ توجہ لگے۔ اتفاق اور اختلاف دونوں توجہ کے رخ ہیں

محمد ابوالخیر کشفی

آج کے سائنسی دَور میں ادب و شعر کی اہمیت

جنابِ صدر!

کسی اُستاد کے لیے اِس سے بڑا کوئی اعزاز نہیں ہوسکتا کہ اُسے کوئی جامعہ توسیعی خطبہ کی دعوت دے۔آپ نے مجھے یہ عزت عطا فرمائی ہے اور آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہر لفظ مجھے چھوٹا معلوم ہو رہا ہے۔

میں پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا ذاتی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج کی گفتگو کے لیے موضوع کا تعین کر کے انہوں نے میرے کام کو سہل تر کر دیا۔

آج کے سائنسی دَور میں ادب و شعر کی اہمیت۔ یہ ہے آج کا موضوع۔ اگر ہم چاہیں تو اپنے اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کے پیشِ نظر سائنس اور ٹیکنالوجی کا دَور بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ ٹیکنالوجی، سائنس کا اطلاقی پہلو ہے اور ہم برآمد کردہ ٹیکنالوجی کے برزخ میں زندگی گزار رہے ہیں۔سائنس کی بلند تر سطح کی طرف ہم نے سفر کا آغاز نو اب کیا ہے۔

یہ گفتگو اعلیٰ تعلیم کے ایک ادارے میں ہو رہی ہے۔اس کے پیشِ نظر میں شعر و ادب کی اہمیت کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی تدریس کو بھی اپنے موضوعِ گفتگو میں شامل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں بلکہ آپ کی اجازت سے علومِ عمرانی اور فنونِ لطیفہ کا حوالہ بھی دینا پسند کروں گا کیوں کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ہماری جامعات میں ان کے ساتھ کچھ ویسا ہی سلوک کیا جا رہا ہے جیسے برطانیہ میں برِعظیم پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے نو آبادکاروں کے ساتھ۔

اس تبدیلی کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ حصولِ علم کے مقاصد بدل گئے ہیں۔کبھی انسانی ذخیرۂ علم، نقطۂ نظر اور تناظر میں وسعت اور اضافہ علم کا مقصد تھا۔ دوسرے لفظوں میں علم اپنا مقصد آپ تھا، اس علم کو آپ علمِ غیر نافع نہیں کہہ سکتے۔اسلام نے علمِ نافع پر بہت زور دیا ہے اور مسنون

دعاؤں میں اس علم سے پناہ مانگی گئی ہے جو نافع نہ ہو۔ مغرب میں بھی علم جب مذہب سے وابستہ تھا تو رُوح کی نجات اس کا منشا تھی۔ پھر رُوح نے ذہن کے لیے جگہ خالی کردی اور یہ ثنویت رُوح اور ذہن کے درمیان حجاب بن گئی۔ اسلام میں یہ ثنویت نہیں۔ رُوح، ذہن اور جسم کے تقاضوں کے درمیان یہاں توازن ہے اور یہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔

ذہن اور جسم کے تقاضوں کو سائنسی تعلیم نے بھی نظر انداز نہیں کیا ہے لیکن یہ توازن جس کا ذکر کیا گیا، بکھر چکا ہے۔ جب مغرب کا نیا نظامِ تعلیم ہم پر مسلط کیا گیا تو ہمارے بزرگوں نے مزاحمت کی۔ یہ مزاحمت تنگ نظری پر مبنی نہیں تھی بلکہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے الفاظ میں ''وہ ایسے نظامِ تعلیم کے وارث تھے جو رُوح، دل اور ذہن کے تقاضوں کو تسلی بخش طور پر پورا کر رہا تھا۔'' دینیات اور الٰہیات کے ساتھ ساتھ فلسفہ، طب اور ریاضی کی تعلیم اُن کے نصاب کا جز تھی۔

مغرب کے تعلیمی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں ڈاکٹر قریشی مرحوم کی یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ''یہ رابطہ مشرق و مغرب کے علماء کے درمیان پیدا نہیں ہوا بلکہ حاکم و محکوم کے درمیان پیدا ہوا۔'' اور پھر ماضی کی علمی روایت سے رشتہ توڑ کر جدید تکنیکی اور سائنسی علوم نے صرف پیٹ اور سامراج کے استحصالی مقاصد سے ہمارا رشتہ جوڑ دیا۔ جدید معاشی اور سیاسی نظام کے لیے جدید علوم۔

یہ ساری تبدیلیاں تاریخ کے عمل کے طور پر رونما ہوئیں۔ مغل ثقافت کے بہترین ترجمان غالب کے ہاں ماضی کی روایت کی پاسداری ضرور ملتی ہے مگر وہ ہماری انیسویں صدی کی اجتماعی تاریخ کے مرغِ بادنما ہیں۔ جدید تکنیکی دور کے ساتھ جو تبدیلیاں آئیں، غالب ہمیں اُن کے طرف دار نظر آتے ہیں۔ ''آئینِ اکبری'' ایک ایسی دستاویز ہے جس سے ملکی معاملات کے انتظام و انصرام کے اداروں کے ارتقا میں اپنے بزرگوں کی تخلیقی اور انتظامی کاوش اور کردار کا اندازہ ہوتا ہے مگر جب تاریخ کے اس دوراہے پر سر سیّد احمد خان نے ''آئینِ اکبری'' کی تصحیح و تہذیب کر کے غالب سے تقریظ لکھوائی تو غالب نے اس کاوش کو ''کارِ مُردہ پروردن'' قرار دیا اور اس علمی کارنامے کو ''ننگ و عارِ ہمت والا'' کہا۔ انہوں نے سر سیّد کو مشورہ دیا کہ وہ آئینِ ماضی کی جگہ اب اس نئے منظر

پر نظر جمائیں جس میں جہاز ہوا اور موج سے بے نیاز ہو کر سمندر کا سینہ چیرتے نظر آتے ہیں جہاں راتیں بے روغنِ چراغ روشن ہیں۔

تاچہ افسوں خواندہ اندایناں مآب
درود کشتی راہمی راند درآب
گر دُخانِ کشتی بہ جیحوں می برد
گر دُخانِ گردوں بہ ہاموں می برد
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ
شبہا روشن گشتہ درشب بے چراغ

ہمیں تاریخ کے اس عمل پر اب اظہارِ ندامت کی ضرورت نہیں۔ اس دورِ غلامی نے ہمیں علمی اور ذہنی طور پر جو کچھ دیا ہے اس سے انکار بھی منصفی کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ دورِ غلامی کے ناقص نظامِ تعلیم نے، جسے اقبال نے دین و مروت کے خلاف سازش کہا ہے، ہمیں جمہوریت، نئے سیاسی، معاشی اور علمی نظریات سے آگاہی بخشی ہے اور ہمارے علمی اُفق کو وسیع تر کیا ہے لیکن اب ایک آزاد قوم کی حیثیت سے گم شدہ توازن کی تلاش ہمارا فریضہ ہے کہ اسی میں ہماری نجات ہے...... اور اس توازن کی تلاش ہمیں ادب کی بارگاہ تک لے جائے گی کیوں کہ اعلیٰ ادب کا مقصد تفہیمِ آدم اور انسان سازی ہے۔ اس باب میں ادب نے فلسفہ و دین سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ فلسفہ ہمیں اپنے آپ کو اس کائنات کو اور اس کائنات کے ساتھ انسان کے رشتہ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ تصوف ہماری شاعری میں فلسفہ کا قائم مقام تھا اور ہمارے شعری تصوف میں وحدتِ وجود کو برتری حاصل تھی جس کی رو سے اعتباراتِ عالم کی تہ میں صرف واجب تعالیٰ کا ارادہ عاملِ قوی ہے۔ عالم اس سے الگ کوئی چیز نہیں، ذات و صفات کی تفریق بے معنی ہے اور عالم ایک وجودِ اعتباری ہے۔ تصوف کے علاوہ بھی ہمارے شعراء مشرقی فلسفہ کے مختلف دبستانوں سے متاثر ہوئے جن کی جڑیں فلسفۂ یونان میں پیوست ہیں۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ سب سے مقبول صنف غزل اپنے

پیکر کے اعتبار سے کسی نظامِ فکر کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی تھی، اس لیے اُردو میں اعلیٰ درجہ کے بہت سے فلسفیانہ اشعار تو ہیں لیکن اقبال سے پہلے کوئی فلسفی شاعر نظر نہیں آتا۔

فلسفہ ہمیں اپنے آپ سے اور مسائل سے اُلجھنے کی قوت عطا کرتا ہے لیکن فلسفہ ہمیں وہ یقین نہیں دے سکتا جو حیاتِ انسانی کے لیے دین کا تحفہ اور عطیہ ہے۔ اگر ہر قدر اضافی ٹھہرے تو انسانی تاریخ کا تسلسل ٹوٹ جائے۔ مستقل اقدارِ حیات ہمیں دین سے حاصل ہوئی ہیں اور انہیں اقدار کو تخلیقی انداز میں پیش کر کے ادب نے ہمیں اپنے تئیں آدمی بنانے کا سبق دیا ہے۔ تغیر و تبدل کی اس دنیا میں ہمارے ادب ہی نے اُن اقدار کی پاس داری کی جو اُسے دین سے حاصل ہوئی تھیں اور ادب نے یہ وظیفہ اُس دَور میں سرانجام دیا جب منبر و محراب سے اُٹھنے والی صدائیں سوزِ دروں سے خالی تھیں اور جن میں دل شامل نہ تھا۔ ادب نے ہمیں اپنے دل میں جھانکنے کی جرأت عطا کی، ادب کائنات کو صحیح تناظر میں دیکھنے کا وسیلہ بنا، ادب انسان اور انسان، انسان اور کائنات، انسان اور خدا کے درمیان مکالمہ بنا اور ہمارے دینی افکار نے ادب کے موثر قالب میں ڈھل کر ہمیں مکمل طور پر بکھرنے نہیں دیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اگر ادب کے ایک حصہ میں تصوف و فلسفہ کے زیرِ اثر عالم حلقۂ دامِ خیال کی صورت اُبھرتا ہے تو دوسری طرف ادب دین کی مدد سے ہمیں یہ بتاتا ہے کہ آفاق کی کارگہ شیشہ گری حق کی بنیادوں پر استوار ہے اور یہ کائنات بالحق کی پیدا کی گئی ہے یا یہ انسان پر جبر ہی کی تصویر نہیں بلکہ اُس کے اختیار کا مرقع بھی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر ہمارا فلسفی شاعر فلسفہ کو زندگی سے دُوری اور انجامِ خرد سے بے حضوری قرار دیتا ہے۔

آج کا موضوع فلسفہ و دین کی آویزش یا ادب، فلسفہ و دین کا رشتہ نہیں ہے لیکن اس پہلو کی طرف چند اشارے ضروری تھے۔ ہمارے ادب نے اخوت، مساواتِ انسانی، حوصلہ اور احترامِ ذات، عدل عمل، آفاقیت اور انسانیت کی عالم گیر قدریں دین سے لی ہیں اور تخلیقی انداز میں اُن کا اظہار کیا ہے۔ ادب میں نیکی اور صداقت اُس پھول کی طرح ہیں جو رُوح کی گہرائیوں میں اُگتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو باہر سے ہم پر زبردستی مسلط کی جاسکے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

(میر تقی میرؔ)

خدا ساز تھا آزرِ بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

(میر تقی میرؔ)

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

(سودا)

کچھ دُور نہیں منزل، اُٹھ باندھ کمر حاتم
تجھ کو بھی تو چلنا ہے کیا پوچھے ہے راہی سے

(حاتم)

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

(غالب)

سے لے کر

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

(اقبال)

آدمی آدمی کو بھول گیا
زندگی زندگی کو بھول گئی

(فراق)

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے
تزئین درو بامِ حرم کرتے رہیں گے

(فیض احمد فیض)

تازہ رُخی کائنات ڈھونڈ رہی ہے آئینہ
جستجو ہے ہزار میں، ایک گواہ کے لیے

(عزیز حامد مدنی)

اُس لفظ کی مانند جو کھلتا ہی چلا جائے
یہ ذات و زماں مجھ سے ہی تحریر ہوئے سب

(عبید اللہ علیم)

تمام عمر کی تنہائیاں سمیٹی ہیں
یہی مرے در و دیوار کا مقدر تھا

(مشفق خواجہ)

کیا قیامت ہے کہ خاطر تشنہ لب بھی تھے ہم
صبح بھی آئی تو مجرم ہم ہی گردانے گئے

(خاطر غزنوی)

تنہا کھڑا ہوں میں بھی سرِ کربلائے عصر
اور سوچتا ہوں میرے طرف دار کیا ہوئے

(محسن احسان)

خیموں میں چراغ بجھ رہے ہیں
یہ وقت فرار کا نہیں ہے

(سلیم کوثر)

زمیں پہ خونِ شہیداں بہار لے آیا
وہ دیکھ سامنے پتھر پر پھول کھلتا ہے

(کرار نوری)

ممکن ہے کہ اُردو غزل کا یہ انتخاب آپ کو طویل معلوم ہوا ہو مگر اُردو غزل کی عظیم روایات کے پیشِ نظر یہ ایک مختصر اور ناقص انتخاب ہے۔ میں نے موضوع کے پیش نظر وہ چند اشعار کاغذ کے سینے پر اُتار دیئے جن کا رشتہ آج کی گفتگو سے ہے۔ ان اشعار میں کائنات کی ماہیت' اپنے آپ کو آدمی بنانے کی خواہش' حوصلہ' انسانی امکانات کے راستے کی رکاوٹوں' انسان کی عظمت اور اسی کے ساتھ ساتھ انسان کی انسان سے دُوری کو پیش کیا گیا ہے۔ کلاسیکی شعراء کے مقابل عہدِ حاضر کے پاکستانی شعراء کی اکثریت بھی شعوری ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ سائنسی دَور کے شاعر کے پاس ہمیں دینے کے لیے کیا کچھ ہے۔ انسان تازہ رخِ کائنات کا گواہ ہے' ذات و زماں اُسی سے تحریر ہوئے ہیں' تمام عمر کی تنہائیوں کو اپنے در و دیوار اور ذات میں سمیٹنے والا ہی کائنات کا مرکزی نقطہ ہے۔ آخری تین شعر اپنی ترتیب اور اپنی مرضی سے میرے حافظے میں آئے ہیں۔ ان کے ربط میں تاریخ انسانی کی شہادتوں اور قربانیوں کے باب سمٹ آئے ہیں۔ سرِ کربلائے عصر کھڑا انسان' خیموں کے بجھتے ہوئے چراغوں کو دیکھ کر پامردی اور ثبات کا فیصلہ کرتا ہے اور لمحۂ رواں میں اسے مستقبل کی بہار نظر آ جاتی ہے۔ جب ہیروشیما پر بم باری ہوئی تھی اور زندگی کا ہر نشان اُس شہر میں معدوم ہو گیا تھا تو سائنس دانوں کا خیال تھا کہ اب یہاں کی زمیں روئیدگی کی قوت سے محروم ہو گئی ہے لیکن اگلے سال موسمِ بہار نے زمین کی قوتِ نمو پر نئی شہادت دی اور وہ یوں کہ ہری کونپلیں دھرتی کی کوکھ سے پھوٹ نکلیں۔

ان مثالوں سے پہلے میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ادب کا کام دین کی عطا کردہ اقدار کی بنا پر انسان سازی ہے۔ انسان سازی وہ منزل ہے جس تک پہنچنے کے لیے ہمیں انسان اور کائنات کے پیچ در پیچ رشتوں کو سمجھنا پڑتا ہے اور اس تفہیم کی راہ میں سائنس بھی ہماری مدد کرتی ہے کیوں کہ سائنس'

تفہیمِ فطرت اور تسخیرِ فطرت کے عمل کا نام ہے۔ ادب کے اس وظیفے کی بنا پر آج کے سائنسی عہد میں اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ سائنس کے اصولوں کی بنا پر ٹیکنالوجی نے زندگی کے کاروبار کو ہم پر آسان کر دیا ہے۔ بجلی کا بٹن دبایئے تو گھر روشن ہو جاتا ہے' ٹیلی ویژن ہمارے کمرے میں دنیا کے مناظر کو لے کر آ گیا ہے' لیکن یہ فیصلہ ہمیں کرنا ہوگا کہ بجلی کی روشنی کے استعمال کا مقصد کیا ہے؟ اس روشنی میں علم کا حصول یا روشنی کے بنتے بگڑتے رنگ رنگ دائروں میں انسانی جسم کی نمائش۔ ہم وی سی آر پر ایسی فلمیں دیکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے اچھے سوئے ہوئے جذبات کو جگا کر ایک بہتر زندگی کی تعمیر میں ممد و معاون ہو سکیں یا ایسی فلمیں جنہیں ہم فحش کہتے ہیں اور ہمارا دَور بلیو فلم کہہ کر اُس رنگ کو رُسوا کرتا ہے جس سے بے کرانی اور وسعت کا گہرا احساس حاصل ہوتا ہے۔

خواتین و حضرات!

جس بنیادی سوال کے حوالے سے ہم آج کے سائنسی دَور میں شعر و ادب کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ سائنس کو ہماری خادمہ کے طور پر ہماری زندگی اور اقدارِ عالیہ کی خدمت کرنی ہے یا ہمیں سائنس کا محکوم بن کر رہنا ہے۔

خواجہ غلام السیدین مرحوم کے خیال میں عہدِ حاضر کی تعمیر دو قوتیں کر رہی ہیں سائنس اور جمہوریت۔ جمہوریت ہمیں سیاسی اور سماجی بندشوں سے نجات دلاتی ہے اور سائنس توہمات و جہالت سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ تسخیرِ فطرت کے عملِ مسلسل میں مصروف ہے۔ وسعت اور ہمہ گیری جمہوریت اور سائنس کے درمیان قدرِ مشترک ہیں۔ دونوں کا مقصد ہے "ترقی کی برکات سب کے لیے۔"

اس بات کو بھی اُسی حوالے سے دیکھیے کہ ہمیں سائنس کی چاکری کرنی ہے یا سائنس سے زندگی سازی کا کام لینا ہے۔ آج سائنس اپنے اس تخلیقی اور تعمیری کردار سے محروم ہو گئی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی بڑی قوموں کے ہاتھوں میں لالچ اور استحصال کا سب سے موثر حربہ ہے۔ اسی صورت حال کے پیشِ نظر امریکی مفکروں کی ایک جماعت نے وہ مشترکہ نعرہ لگایا تھا جو ضرب المثل

کے درجہ تک پہنچ گیا تھا Scince should be given a holiday اب سائنس کو چھٹی دے دی جائے، مگر خواتین وحضرات! سائنس کو چھٹی پر بھیجنا شاید اتنا ہی مشکل ہوگا جتنا آج کی کسی آرام طلب اور فیشن ایبل خاتون کے لیے اپنے ملازم یا ملازمہ کی چھٹی کو منظور کرنا' اور اسی لیے ایک ادیب نے کہا کہ سائنس کو ادب اور عمرانی علوم کے ساتھ ایک تفریحی سفر پر بھیج دیا جائے تا کہ جب اس سفر سے یہ لوٹیں تو سائنس کے دل میں ادب کی نرمی اور علومِ عمرانی کی وسعت ہو اور علومِ عمرانی میں سائنس کی قطعیت اور زیادہ آ گئی ہو اور ادب سائنس اور علومِ عمرانی کے نظریات کو ایک تخلیقی جذبہ میں ڈھالنے کے اور زیادہ قابل ہو گیا۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اس سے ادیب کا نقطہ نظر بنیادی طور پر واضح ہو گیا ہوگا۔ ادیب، سائنس اور ٹیکنالوجی کے خلاف نہیں۔ وہ تو سائنس، سماج اور فرد کو ہم رشتہ کرنا چاہتا ہے۔ انسانیت کی تاریخ اسی رشتہ کی کہانی ہے۔ فن کار اور ادیب خواب دیکھتا رہا ہے اور سائنس داں اُن خوابوں کو حقیقت کا پیراہن اور پیکر عطا کرتے رہے ہیں لینارڈو داونسی نے کب انسان کی پرواز کا خواب دیکھا تھا اور ایک پروازی مشین کی تصویر بھی بنائی تھی۔ الف لیلیٰ کے قصوں میں شہزادے شہ زادیاں، سوداگر بچے کس طرح طلسمی قالینوں پر اُڑتے پھرتے ہیں۔ انسان کی اِسی خواب دیکھنے کی صلاحیت نے ہمیں دیو پیکر کانکارڈ اور جمبو جیٹ کے اس عہد میں پہنچا دیا کہ اب لاہور سے پشاور تک فوکر میں پرواز کرنے والے اسے طیارے کی جگہ طیارچہ کہتے ہیں۔

انسان اور معاشرہ کے رشتے کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ آج خود انسان کی بقا اور تحفظ کا ہے۔ امریکہ میں آپ برانکس چڑیا گھر کی سیر کرتے کرتے ایک ایسے کمرے کے دروازے پر پہنچتے ہیں جس پر لکھا ہے "دنیا کا سب سے خطرناک جانور" آپ اس کمرے میں داخل ہوں تو وہاں ایک قدِ آدم آئینہ لگا ہے جس میں آپ اپنی شبیہ دیکھتے ہیں۔ سائنس نے انسان کو جو قوت عطا کر دی ہے اس نے اسے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ بنا دیا ہے۔ ایسا خطرہ کہ اب آدمی کو فطرت کی تسخیر کی جگہ اپنی تسخیر کو اولیت دینی ہوگی۔ اس سے پہلے میں نے مختلف سیاق وسباق میں اس تسخیرِ آدم کو آدم سازی

کہا ہے۔ادب اس تسخیر کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ ارسطو نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ تنقیہ (کتھارسس) اس کے سوا اور کیا ہے۔آج کا آدمی اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ اسی لیے ہے کہ وہ اپنے جذبات اور تصورات کو شہوات کی سطح سے بلند کر کے ایک مثبت اور تعمیری قوت نہیں بنا رہا اور یہ عمل مذہب اور ادب کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ذہن میں زلزلے لیے عہدِ خلا میں آ گیا
آدمِ نو کے ہاتھ سے عصرِ رواں کی خیر ہو

اور مسئلہ صرف عصرِ رواں کا نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کا ہے۔

آج کے موضوع پر جو کچھ کہا جا سکتا ہے' اسے ہمارے عظیم شاعر اقبال نے اپنے چند شعروں میں سمیٹ لیا ہے۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا

خواتین و حضرات!

سائنس کی مدد سے ستاروں کی گزرگاہوں کو تلاش کرنے والا آدمِ خاکی چاند کی سرزمین پر قدم رکھ چکا ہے اور اب مریخ ہی کی طرف رواں نہیں بلکہ اُن جہانوں کو تلاش کر رہا ہے جو ابھی بے نمود ہیں' لیکن یہی انسان اپنے پڑوسی کی آنکھوں کے آنسوؤں کو نہیں دیکھ پاتا۔ سڑک چلتے ہوئے' ہمیں

لوگوں کے چہروں پر کرب کی لکیریں نظر نہیں آتیں۔

کوئی آگاہ نہیں باطنِ یک دیگر سے

ہے ہر اک شخص جہاں میں ورقِ ناخواندہ

ادب اسی ورقِ ناخواندہ کو پڑھنے کی کوشش کا نام ہے۔

تھوڑی دیر پہلے میں نے مذہب اور ادب کا ساتھ ساتھ ذکر کیا تھا۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مذہب جب ذاتی تخلیقی تجربہ بن جاتا ہے تو سچے ادب کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور یہ تو عرض کر ہی چکا ہوں کہ ادب کو اقدار مذہب سے حاصل ہوئی ہیں، لیکن قلوبِ انسانی میں دین کی اقدار ادب کے وسیلے ہی سے جڑ پکڑتی ہیں اور یوں کلمہ طیبہ وہ شجر بن جاتا ہے جس کی جڑیں قلبِ انسانی میں ہوتی ہیں اور شاخیں عرشِ الٰہی کو جا چھوتی ہیں۔ قرآنِ حکیم کے اسالیب، ہمارے ادبی اسالیب کی اساس ہونے کے ساتھ ساتھ لفظ کی قوت کا سب سے بڑا مظہر ہیں۔ حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فصاحت کو اپنی خصائص شمار فرمایا ہے۔

فصاحتِ نبویؐ وہ زندہ معجزہ ہے جو احادیث کے ہر لفظ میں آج بھی جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے اور جب ضمیرِ حرم اور دلِ ملّا اس معجزہ کی چھوٹ سے محروم ہوا تو ہماری نسلیں حرم سے بدگماں ہو گئیں۔ حقائقِ ازلی و ابدی کا اظہار بے جان طور پر محراب و منبر سے ہونے لگا مگر قال اللہ اور قال الرسول کی بے قلب تکرار نے دلوں کی دنیا میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا لیکن جب انہیں حقائق کو کوئی حالیؔ، کوئی شبلیؔ اور کوئی اقبالؔ مل گیا تو دلِ مُردہ جاگ اُٹھے۔

میں اس گفتگو کو آج کے موضوع ہی سے متعلق سمجھتا ہوں کیوں کہ اس کا علاقہ امتوں کے مرض کہن کے علاج سے ہے اور یہ سائنس کے بس کی بات نہیں۔

خواتین وحضرات!

اس ساری گفتگو سے ایک بات منطقی طور پر بالواسطہ اُبھری ہے اور وہ یہ کہ شاعری ہمیں زندگی کی گہری آگاہی عطا کرتی ہے اور وہ اس طرح کہ وہ ہمیں بہتر انسان بناتی ہے۔ تخیل کی تمثیلوں اور

مثالوں کے ذریعہ شاعری سطحوں سے گزر کر حقیقت کے دل تک پہنچتی ہے۔افلاطون اور ارسطو نے شاعری کو نقالی کہا تھا۔افلاطون کے ہاں تو یہ تصور کچھ محدود ہے مگر ارسطو کے ہاں نقالی سے مراد تجربہ کی تخلیق نو اور ترتیبِ نو ہے۔

شاعری صرف احساس اور جذبہ تک محدود نہیں۔شاعری علم کے حصول کا بھی ویسے ہی ایک وسیلہ ہے جیسے سائنس۔۱۸۹۲ء میں سائنس داں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ تعقل اور دلیل ہی علم کی بنیاد ہے' تخیل نہیں۔لیکن کیا کسی چیز کا احساس اتنا ہی حقیقی نہیں ہوتا جس قدر کوئی حقیقت یا وہ چیز جو محسوس کی گئی ہو۔اور اب تو جدید تر سائنس تصورات کے عالم سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔میں سائنس کا طالب علم نہیں' لیکن اس حقیقت تک میری رسائی سائنس کے عالموں کی مدد سے ہوئی ہے۔ مارٹن جانسن نے Art and Scientific Thought میں کئی اہم نکتے اُٹھائے ہیں۔ ایٹم' الیکٹرونس' الیکٹرون لہریں۔یہ اشیا راست طور پر نہ دیکھی جا سکتی ہیں نہ چھوئی جا سکتی ہیں اور نہ سُنی جا سکتی ہیں۔آج کے ماہرِ طبیعات کی نظر میں تو کائنات' شعوری اور منظم طور پر تصورات کا ایک بُنا ہوا ڈھانچہ (a deliberately woven structure of ideas) ہے۔

یوں سائنس اور فنونِ لطیفہ وادب کے فاصلے سمٹتے جا رہے ہیں۔سائنس اور فنونِ لطیفہ کا یہ رشتہ کوئی نئی بات نہیں۔مسلمانوں کے فنِ تعمیر نے ریاضی کے اُصولوں اور اشکال کو تخلیقی طور پر اپنایا ہے۔اسی طرح ہماری خطاطی میں بھی ریاضی کی اشکال کے آثار موجود ہیں اور ہماری عمارتوں پر جو خطاطی کے نمونے کندہ ملتے ہیں وہ بصریات کا شاہکار ہیں۔پوری عبارتیں فاصلہ کے فرق کے باوجود یکساں نظر آتی ہیں۔ہماری عمارتوں میں دائرے' نیم دائرے' مثلث' معکوس مثلث' سیدھی مثلثوں میں گولائی اور شش پہلو' نیم مثمن بُرج۔یہ سب ہمارے فنِ تعمیر اور ریاضی کی ہم آہنگی کی داستاں کے ابواب ہیں۔یہ اثرات عمارتوں کی منصوبہ بندی سے لے کر محرابوں' رواقوں اور کنگوروں تک ہر جگہ نظر آتے ہیں۔یہ داستاں یہیں تک محدود نہیں بلکہ اسلامی فنِ تعمیر میں بازنطینی' یونانی اور

ساسانی اثرات کی آمیزش مسلمانوں کے ذوقِ توازن کی شہادت ہے۔اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ' دانش گاہ پنجاب کی پندرھویں جلد میں اسلامی فنِ تعمیر کی تاریخ' صفحہ ۶۷۷ سے صفحہ ۸۵۳ تک خاصی تفصیل' نقشوں اور خاکوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔آپ تفاصیل وہاں ملاحظہ کرسکتے ہیں۔اسی طرح ہماری خطاطی کے مختلف خط بھی ریاضی کے اُصولوں کی عملی عکاسی کرتے ہیں۔سلجوقی خطِ کوفی میں زاویے زیادہ نمایاں تھے اور ایرانی خطِ کوفی میں افقی حصوں کی جگہ عمودی حصوں پر زیادہ زور دیا گیا۔اندلسی کوفی خط میں زاویوں کی جگہ دائروں نے لے لی اور یوں یہ اسلوب حدودِ نسخ میں داخل ہوگیا۔خطِ ثلث کا نام ہی ریاضی سے اُس کے رشتہ کی شہادت ہے۔اسلامی فنِ خطاطی کی تاریخ و تنقید بھی آپ کو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کی اسی جلد میں ملے گی۔

شاعری کا تعلق بھی کاروبارِ حیات' ہمارے تجربوں اور ہمارے اُن جذبوں سے ہے' جن کی حدود یہی حسّی دنیا قائم کرتی ہے لیکن شاعری اس حسی دنیا کے علاوہ سائنس سے بھی مواد حاصل کرکے ہمیں ماوراتک لے جاتی ہے۔محدود کو لامحدود سے ہم رشتہ کردینا' محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرنا' شعروادب کی معراج ہے۔رنگ' خطوط' حرف وصوت اور الفاظ وسائلِ اظہار ہیں اور یہ بات بدیہی ہے کہ وسائلِ اظہار سے تعلق رکھنے والے انسانی علم میں اضافہ کرتے ہیں۔حیاتیات کے عالم پروفیسر جے زیڈ ینگ (J.Z.Young) نے اس سلسلہ میں لکھا ہے۔

> ''بہت سے افراد وسائلِ اظہار یا اُن کے مطالعہ کے ذریعہ ہمارے علم میں اضافہ کررہے ہیں۔آرٹسٹ' نقاد' تخلیقی لکھنے والے اور دانش ور۔تخلیقی فن کار ایسا مبصر ہے' جس کا ذہن نئی سمتوں میں سفر کرتا ہے اور وہ لوگوں تک ایسے مسائل کے ابلاغ کو ممکن بنادیتا ہے جو پہلے ابلاغ کا موضوع نہ تھے (ابلاغ کی گرفت میں نہ آئے تھے)۔یہ فن کار وسائلِ ابلاغ کی تلاش کے ذریعہ ہمارے مشاہدے اور علم میں اضافہ کرتے ہیں اور اس مرحلہ پر سائنس داں اور فن کار ایک ہوجاتے ہیں۔''

تخلیقی فن کاروں، دانش وروں، فلسفیوں اور نقادوں نے مراقبہ اور حد درجہ شخصی تجربات کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر اقبال نے اپنے خطبات میں تصوف کے مقامات ومشاہدات کو فلسفیانہ اصطلاحوں کے ذریعہ ابلاغ کا موضوع بنایا ہے۔ اسی طرح ہر دور میں شعر وادب نے سائنس کے انکشافات کو شخصی تجربہ میں ڈھال کر اپنا موضوع بنایا ہے، یوں نئے مسائل، ابلاغ کی گرفت میں آتے جاتے ہیں اور سائنس کے مسائل شعر وادب کا موضوع اس طرح بنتے ہیں کہ حیاتِ انسانی سے اُن کا رشتہ واضح تر ہوجاتا ہے۔ شاعری محض کسی سائنسی انکشاف وایجاد کے ذکر کو کافی نہیں سمجھتی بلکہ اسے انسان کی زندگی کے حوالے سے دیکھتی ہے۔ سنجیدہ فکری شاعری کا ذکر اس سیاق وسباق میں اختصار کے ساتھ پیش کروں گا، مگر اس سے پہلے یہ بھی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ مزاحیہ شاعری میں بھی سائنس کی ایجادوں کو انسانی معاملات کا حصہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

(اکبرالہ آبادی)

ریکارڈ میں حالِ دلِ بے تاب بھروں گا
بدنام کروں گا میں تمہیں خلقِ خدا میں

(نامعلوم)

شاعری کا حصہ بننے سے پہلے سائنسی موضوعات کا معاشرہ کی کسی نہ کسی سطح پر عام ہوجانا لازم ہے، یعنی وہ سائنسی حقائق، تصورات اور آ گاہی معاشرہ کے فن اور زندگی کا حصہ ہو۔ بعض موضوعات یقیناً ایسے ہوں گے جو معاشرہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد تک محدود ہوں گے، مثال کے طور پر مسئلہ زمان ومکاں، جو فلسفہ کے دائرہ سے نکل کر ہمارے عہد میں ایسا سائنسی مسئلہ بن گیا جس نے کائنات کے بارے میں ہمارے فکر کی دُنیا بدل دی۔ کچھ موضوعات ایسے ہوں گے جن کو معاشرہ کے مختلف طبقے

کسی نہ کسی حد تک سمجھتے ہوں مثلاً آج جوہری توانائی کا مسئلہ۔ اس آگاہی کو فن کار اپنی ذات کا حصہ بنا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ محض ایک اوپری چیز نہیں رہ جاتی بلکہ ایک حیات گر قوت بن جاتی ہے۔

سائنسی افکار و تصورات کا اثر ہماری شاعری پر انیسویں صدی ہی سے پڑنے لگا۔ فلک کی گردش اُردو فارسی شاعری کا ایک محبوب موضوع ہے انتہا یہ کہ آج بھی یہ تصور زندہ ہے

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے، جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(انشا اللہ خان انشا)

اور ہمارے عہد کے شاعر جذبی کا شعر

آج کیا ہونے کو ہے اے گردشِ ہفت آسماں
ہر ستارہ لرزہ براندام ہے میرے لیے

لیکن مومن خان مومن نے زمین کی گردش کو اپنا موضوعِ سخن بنایا کیوں کہ وہ ایک ایسے دَور کے شاعر تھے جب مغربی سائنس کے اصولوں کا ذکر معاشرہ میں شروع ہو چکا تھا اور دلّی کالج میں نئے علوم و تصورات کی تدریس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ''غالب اور آہنگِ غالب'' میں انیسویں صدی کی ذہنی فضا کو پیش کرتے ہوئے مومن کے اس شعر کا حوالہ دیا۔

کُرۂ خاک ہے گردش میں، تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

خود غالب کے ہاں سائنسی آگاہی، تخلیقی سطح کی بلندیوں پر پہنچتی نظر آتی ہے۔

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

....

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

....

ضعف سے گریہ مُبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہَوا ہوجانا

آج کی شاعری میں یہ رنگ کچھ اور اُبھر آیا ہے

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیل گوں کو آسماں سمجھا تھا میں
(اقبال)

کیا قیامت ہے کہ ذرے کا بھی دل ٹوٹ گیا
سوچتا یہ ہوں کہیں جائے اماں ہے کہ نہیں
(فضل احمد کریم فضلی)

دورِ تسخیرِ قمر، دورِ شکست جوہر
عہدِ حاضر میں کئی دَور نظر سے گزرے
(ولی ہاشمی)

کس خلائے نظر کے بھرنے کو
یہ زمیں آسماں ہے، کیا معلوم
(جوش ملیح آبادی)

میں خلاؤں میں کسی کے ساتھ محوِ خواب تھا
میری فرقت میں زمیں روتی رہی کل رات کو
(ابوالخیر کشفی)

یہ غزلوں کے چند اشعار ہیں۔ آج کے کئی اہم شعرا کی نظموں میں سائنسی انکشافات و معلومات کو انسانی زندگی کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اسپتنک اور خلائی سیاروں اور تسخیر قمر پر بہت سی نظمیں کہی گئی ہیں، لیکن اس سلسلہ میں آج بھی سب سے بڑا نام اقبال کا ہے۔ تصورِ زمان و مکاں کے بوجھ کو شاعری نے اقبال کی مدد سے اُٹھالیا ہے۔ مسئلہ زمان و مکاں، سائنس کا مسئلہ بننے سے پہلے فلسفہ کا ایک مہم مسئلہ تھا۔ مسلمانوں نے یونانیوں کے خیالات کا اعادہ نہیں کیا بلکہ اس سلسلہ میں فکرِ انسانی کو آگے بڑھایا۔ زمان کے مسئلہ کو مسلمان صوفیا نے وجود کے مسئلے سے ہم رشتہ کیا اور وجود کے مراتب قائم کیے۔ اس بحث کو جناب الیاق عشقی نے اپنے مضمون حقیقتِ زماں میں بڑے سلیقے سے سمیٹا ہے۔ اقبال کے دَور میں آئن اسٹائن کی بدولت یہ مسئلہ ایک سائنسی مسئلہ بن گیا۔ اقبال نے اس مسئلہ کو ملتِ اسلامیہ کے لیے موت وحیات کا مسئلہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا مقالہ ''اقبال کا تصورِ زمان و مکاں'' اس موضوع پر اقبال کے افکار کی معتبر تفسیر اور تنقید ہے۔ نظریۂ اضافیت سے فکرِ انسانی میں دوررس تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ زمان و مکاں کی مطلقیت کا تصور ختم ہوا اور وہ ''اضافی اور ایک دوسرے پر منحصر'' قرار پائے۔ آئن اسٹائن کے تفکر نے دُنیا کو سہ ابعادی کی جگہ چہار ابعادی بنادیا۔ اقبال نے ان سارے دقیق مسئلوں کو اپنی شاعری میں یوں پیش کیا کہ عام قاری ان کی مکمل تفہیم کے بغیر بھی ان کی اہمیت کو سمجھ لیتا ہے اور یہ فلسفہ ایک احساس کی صورت اس کے اندر رقص کرنے لگتا ہے۔ اسی نظریۂ اضافیت سے معراج کی نئی تشریح سامنے آتی ہے۔

چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

اقبال نے ہمیں شاعری کی زبان میں یہ بتادیا ہے کہ فطرت کسی سکونی حقیقت کا نام نہیں جو ''ایک غیر حرکیاتی خلا میں واقع ہو بلکہ وہ ایسے واقعات کا مجموعہ ہے جو اپنے اندر مسلسل تخلیقی بہاؤ کی خاصیت رکھتے ہیں'' (وائٹ ہیڈ بحوالہ رضی الدین صدیقی)۔ زمان و مکاں کے یہ مشکل فلسفیانہ اور سائنسی مسائل اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ کا چہرہ بن کر ادب کے قارئین کے سامنے آتے ہیں۔

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

شاعری کے بارے میں کچھ دیر پہلے عرض کیا گیا تھا کہ وہ ہمیں زندگی اور کائنات کی گہری آگاہی عطا کرتی ہے۔ اب اس مرحلے پر میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ شعر و ادب کائنات کی مختلف اشیا اور حقائق کے باہمی ربط کو، جس طرح سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں اس سے خود سائنس کو ایک نئی جہت حاصل ہو جاتی ہے۔ مسجدِ قرطبہ کی تمہید سلسلۂ روز و شب کے تصرف اور جبر کو یوں پیش کرتی ہے کہ پہلے بند کے خاتمے پر ہمارے ذہن میں عدم کا سناٹا چھا جاتا ہے۔

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

اور دوسرے بند کے آغاز کے ساتھ ہی کائنات نئی سانس لے کر پھر زندہ ہو جاتی ہے۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

یہاں عشق اس قوت کے طور پر اُبھرتا ہے جو وقت پر غالب آ جاتی ہے۔

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

اور پھر مسجدِ قرطبہ عشق کے مظہر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ علوم و فنون کے اساتذہ کے اس محفل میں اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ اور مسئلہ زمان و مکاں پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں۔ اسے تو میں نے ایک مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ اقبال کی نظم "نوائے وقت" میں یہ مسئلہ اور واضح ہو جاتا ہے کہ زماں کو معنویت انسان کی ذات اور عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ وقت انسان سے کہتا ہے

درمن نگری ہیچم، درخود نگری جانم

آج کے موضوعِ گفتگو کے دوسرے پہلو کو چھیڑنے سے پہلے میں نوجوان طلبہ سے یہ گزارش کروں گا کہ وہ پروفیسر رضی الدین صدیقی کی کتاب ''اقبال کا تصورِ زمان و مکاں اور دوسرے مضامین'' میں اس مضمون کے علاوہ ''مذہب اور سائنس اقبال کی نظر میں'' بھی ملاحظہ کریں۔

مشاہدہ، تفکر It become in intellectual content a fpattern of contemjlation and analysis(pp165-6)

یہ کتاب بھی سائنس کی ترقی میں اسلام کے حصے اور اسلامی فنونِ لطیفہ کے سائنسی پہلوؤں کا اچھا احاطہ کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعہ سے حیات و کائنات اور انسانی تاریخ وارتقا کے بارے میں آپ کی بصیرت میں اضافہ ہوگا۔

خواتین وحضرات!

ہمارے عہد میں، جو سائنس کا عہد ہے، زندگی کی رفتار بے حد تیز ہوگئی ہے۔

سیاروں میں کب پہلے یہ گردش و تابش تھی
ہیں موڑ پہ صدیوں کے بن ایک مہینے کے

(فراق گورکھپوری)

اس رفتار کی وجہ سے انسانی شخصیت بکھر رہی ہے، ذہنی امراض بڑھ رہے ہیں، زندگی کی رفتار کا دباؤ ذاتِ انسانی کو کچل رہا ہے۔ ان حالات میں ادب ہمیں وہ مسرت عطا کرتا ہے جو نفسیاتی توازن کا سرچشمہ ہے۔ یوں ادب اس نفسیاتی توازن کے حصول کا وسیلہ ہے۔ کتھارسس یا تزکیۂ نفسی کو صرف المیہ کے مطالعہ تک محدود نہیں سمجھنا چاہئے۔ تنقیہ کا یہ کام ادب مجموعی طور پر سرانجام دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں اگلا نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ نفسیاتی اُلجھنیں اور پیچیدگیاں اُس وقت وجود میں آتی ہیں جب ہم زندگی کی کسی صورتِ حال اور مسائل کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ ادب زندگی کے اس معرکہ میں ہمارا نہایت موثر حربہ ہے۔ برک نے ''فلاسفی آف لٹریری فارم'' میں محاورہ سے لے کر

ادب کے شہ کاروں تک اس پہلو ... سے جائزہ لیا ہے۔ ہمیں ہر زبان کے محاوروں میں پیش بینی، اندازِ زیست اور اخلاقیات کا امتزاج ملتا ہے۔ مختلف زبانوں میں ہزار ہا اختلافات کے باوجود یکساں معانی اور مفاہیم کے جو محاورے ملتے ہیں ابھی تک بڑے پیمانے پر اُن پر کام نہیں کیا گیا ہے۔ اس اشتراک سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان مختلف صورتِ حال اور آزمائشوں سے کس طرح گزرا ہے۔ بڑا ادب بھی ایک بلند تر اور ذہنی سطح پر ''محاورہ'' ہی ہوتا ہے۔ محاوروں کی طرح ادبی کارنامے بھی وہ بیانات ہیں جو زندگی اور انسان کے رشتے کو پیش کرتے ہیں اور زندگی کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ذہنی بحران کے ادوار میں ہمارے لیے فکری اور جذباتی نکاس کا ذریعہ بنتے ہیں۔ حکایات لقمان سے لے کر آج تک کے ادب میں انسانی معاشرہ اور سماج کے رشتہ کو مختلف سطحوں پر پیش کیا گیا ہے۔ برک نے اس سلسلہ میں ایک اہم بات کہی ہے وہ یہ کہ ادب زندگی کے معرکے میں ہماری عسکری حکمتِ عملی (STRATEGY) ہے۔ عسکری حکمتِ عملی کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایسے حالات پیدا کر دیں کہ جہاں ہم چاہیں، جس وقت ہم چاہیں اور جن حالات میں ہم چاہیں، اُن کے تحت دشمن ہم سے لڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اسی کو اقبال نے ہنر کی ضربِ کلیمی کہا ہے

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں!
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا، وہ ہنر کیا؟

اور یہ ضربِ کلیمی کوئی خارجی حربہ نہیں، یہ وہ قوت ہے جو ادب و ہنر کے ذریعہ انسان میں حوصلہ اور نشاط کے روپ میں اُبھرتی ہے۔

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

مختلف ادوار کی ''ہم عصریت'' کا مطالعہ بھی اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار ایک دوسرے کے ہم عصر ہو سکتے ہیں۔ جدید نیویارک نے برک کو زوال آمادہ روم کی

یاد دلائی۔ اسلامی ممالک کا انتشار آج ہمیں زوالِ بغداد کی یاد دلا رہا ہے۔ یوں یہ زمانے "ہم عصر" ہوئے۔ یہ "ہم عصریت" بھی مختلف ادوار میں عظیم ادب کی تازگی اور نیا حوالہ بننے کا ایک سبب ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ نئے حالات اور مواقع پیدا ہوتے ہیں جن کے اظہار کے لیے ادب اور زبان میں نئے الفاظ پیدا ہوتے ہیں، بڑے فنکار نئے استعاروں اور اسالیبِ بیان سے اُلجھتے نظر آتے ہیں۔ کامیابی ان میں سے ہر ایک کا مقدر نہ سہی، مگر ان کا جگر تو دیکھئے۔

جنابِ صدر، خواتین وحضرات!

میں اس مختصر سے وقت میں جو کچھ کہہ سکتا تھا اُسے آپ کے حضور پیش کر دیا۔ میں نے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر کہیں کہیں بات اشاروں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس خطبہ کے آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ادب وفنونِ لطیفہ اور سائنس دونوں ہمارے لیے ہیں اور ہمیں دونوں کی ضرورت ہے۔ ان میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ان کو ایک دوسرے سے تقویت ملی ہے۔ یہ نکتہ اسلامی خطاطی، فنونِ لطیفہ اور اُردو ادب کے حوالے سے میں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج ہمارے ادب کی تازہ کاری میں سائنس کا بڑا حصہ ہے، اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی متوازن تعمیر میں دونوں ایک دوسرے کی رفاقت کا حق ادا کریں گے۔

میں ایک بار پھر آپ کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور رب جلیل سے دُعا کرتا ہوں کہ میں نے آپ کو مایوس نہ کیا ہو۔

(یہ مقالہ ۱۵ مارچ ۸۲ء کو پشاور یونی ورسٹی کے توسیعی خطبات پروگرام کے تحت محمد حیات شیر پاؤ ہال میں توسیعی خطبہ کے طور پر پیش کیا گیا)

ہمارے اَدب کے آفاقی رشتے

(شاعری)

آفاقیت بڑے ادب کی بنیادی صفت ہے۔ انسانیت کے عظیم ذہن جس اُفق پر اپنے فکر و احساس کی عزیز ترین متاعِ عالم انسانیت کے حضور پیش کرتے ہوئے زمان ومکاں کے قیود کو توڑ دیتے ہیں، وہ فنونِ لطیفہ کا اُفق ہے اور بالخصوص ادبیات کا۔ بڑا ادیب اپنے عہد کی پیداوار، اپنی قوم کا فرد اور اپنی روایات کا پرروردہ ہوتے ہوئے اس جہانِ تازہ کی تخلیق کرتا ہے جو سنگ وخشت سے نہیں بلکہ افکارِ تازہ اور خونِ دل سے پیدا ہوتا ہے۔

''آفاقیت کسی فن پارے کی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کی معنویت کسی مخصوص واقعہ، صورت حال، مقام، زمانے اور شخصی حدوں کو توڑتی ہوئی اپنے آپ کو اس آفاق اور کائنات پر محیط کر دیتی ہے۔'' اقبال کی نظم مسجد قرطبہ کسی ایک مسجد سے متعلق نظم نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کے تصورِ جمال اور جمالیاتی قدروں پر خلاقانہ تبصرہ ہونے کے ساتھ ساتھ زمان ومکاں کے جبر اور انسانی ذات کے درمیان کشمکش اور انسان کی آبرومندی کی دستاویز ہے۔ شیکسپیئر کے اوتھیلو Othello کا موضوع وہ ازدواجی شک وشبہ ہے جو آئے دن قتل کا محرک بن کر اخباری خبروں کو جنم دیتا ہے اور بس۔ اوتھیلو نہ کسی تاریخی واقعہ کے پس منظر میں لکھا گیا، نہ یہ بدکاری، قتل اور خودکشی کے واقعاتی امکان تک محدود ہے، بلکہ شیکسپیئر نے اس موضوع کو انسان اور حیاتِ ارضی کی ایک آفاقی صداقت کے درجہ تک پہنچادیا ہے۔

آفاقیت کی تخلیق اسی وقت ممکن ہے جب فن کار زندگی کو ایک کُل کے طور پر دیکھ سکے۔ سعدی کی گلستان کے مختلف ابواب زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقش گری کا درجہ رکھتے ہیں۔ بادشاہوں کا دور گزر گیا مگر گلستان میں شاہوں کے واقعات ان کی سطح سے اُبھر کر ہماری زندگی کے مسائل بننے

کی تاب وتوانائی رکھتے ہیں۔اپنے ادب کی حالیہ مثال کے طور پر سعادت حسن منٹو کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ بُو اور کالی شلوار جیسے افسانوں میں جنس کا مسئلہ، منٹو کی پوری دُنیا معلوم ہوتا ہے مگر موذیل، کھول دو اور ٹھنڈا گوشت میں یہی مسئلہ انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں اور انسانی فطرت کے خیر وشر سے ہم آمیز اور ہم آہنگ ہوکر ادبی ترفع Sublimation کے عمل کی مثال بن جاتا ہے۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ فن کار کی فنی عظمت اور قد وقامت کی نسبت سے عرض کیا گیا ہے۔اس گفتگو کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ادب کی آفاقیت کی تشکیل میں کئی اور عناصر بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ موضوع کی عظمت اور ہمہ گیری ادب کی آفاقیت کی ایک بنیاد ہے۔ کانٹ نے حسن کو یقین کے ساتھ اور ترفع اور رفعت کو لامحدود کے ساتھ وابستہ کیا تھا۔ ادب کی صفات اور خصوصیات کا اظہار یقیناً زبان کے وسیلہ سے ہوتا ہے اور عظمتِ ادب کے مخارج کا یقیناً زبان پر گرفت سے گہرا تعلق ہے لیکن عظیم تصورات، طاقت اور الہامی جذبہ اور کُلیت یا مجموعیت کے بغیر ادب آفاقی نہیں بن سکتا۔ ان عناصر کے بغیر صرف قدرتِ زبان اس سطح سے بلند نہیں ہوتی۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
ایک ذری آپ کو زحمت ہوگی
ذرا ڈال دو اپنی زلفوں کا سایہ
مقدر کسی کا بہت نارسا ہے

....

زلف اُلجھے گی تو شانے سے سُلجھ جائے گی
دل جو اُلجھے گا تو کوئی نہیں سُلجھائے گا

اور جب عظیم تصورات اور زندگی کا وسیع تر مطالعہ ومشاہدہ زبان سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو شاعری اس سطح پر فائز نظر آتی ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری کا
(میرؔ)

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
(غالبؔ)

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوق آشکارائی
کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی
(اقبالؔ)

(۲)

کائنات کی وحدت کا عرفان، انسان، حیات اور کائنات کے رشتہ کا ادراک، اور خالق و مخلوق کے تعلقات کی جہتیں اگر کسی انسانی گروہ کو اپنے ثقافتی ورثہ کے طور پر حاصل ہو جائیں تو اس کے شعر و ادب، فنِ تعمیر اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں آفاقیت کا جلوہ مختلف سطحوں پر بے نقاب نظر آئے گا۔ اس انسانی گروہ کے بڑے فن کار آپ کو کاروبارِ جہاں کو نئے انداز سے دیکھنا سکھائیں گے، اس کے متوسط درجہ کے فن کار آپ کو آفاق اور انسان کی وحدت کے گیت گاتے نظر آئیں گے اور اس کے عام لکھنے والوں اور فن کاروں کے ہاں بھی جغرافیائی حدود ٹوٹتی ہوئی نظر آئیں گی۔ دُنیا میں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہو اس کے ادیب اور شاعر اس ظلم کے خلاف لب کشا نظر آئیں گے۔ امیر مینائی کا شعر اِسی پس منظر میں پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ نہایت درجہ شہرت اور مقبولیت کے باوجود یہ شعر مبتذل کیوں نہیں معلوم ہوتا۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اُردو اور برِ عظیم پاک و ہند کی دوسری زبانوں کے مسلمان ادیبوں کے ہاں آپ کو یہ آفاقیت اور بین الاقوامی نقطہ نظر کم و بیش ہر جگہ نظر آئے گا۔ جنگ طرابلس، جنگ بلقان، اور دولت عثمانیہ کے زوال سے لے کر کشمیر، ویت نام، فلسطین، الجزائر، افریقہ، افغانستان، ہنگری، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ

کے مظلوموں تک۔ ہر جگہ اور ہر ملک کی تحریکِ آزادی کی معاونت ہمارے اہلِ قلم نے اپنی آواز اور فن کے سر، تھ کی ہے۔

میرے اس معروضے کی صداقت اُس وقت آپ پر اور روشن ہو جائے گی جب برِ عظیم کی مختلف زبانوں میں لکھنے والے مسلمان اور غیر مسلمان ادیبوں کی تحریروں کا جامع جائزہ اس نقطہ نظر سے لیا جائے۔ برِ عظیم کے ذہن وفکر کو اسلام نے اس درجہ متاثر کیا ہے کہ بہت سے غیر مسلم فن کاروں کے ہاں فکر کی عالم گیریت اسلامی آثار واثرات سے عبارت ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا ہوں کہ غیر مسلموں کے یہاں یہ آفاقی نقطہ نظر اور انسانی محبت وعظمت کے تصورات نہیں ملتے۔ کہنا یہ ہے کہ مسلم معاشرہ اور اس کے فن کاروں کے ہاں یہ رجحان بہت عام اور قوی نظر آتا ہے۔ میں حسان بن ثابت' سعدی' مولانا روم' حافظ' خسرو' میر' غالب' اقبال' جائسی اور نذرالاسلام کی طرح ہومر' کالی داس' گوئٹے' شیکسپیئر اور دانتے سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں' لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان بڑے فن کاروں میں سے بعض ایک آفاقی ورثہ سے محرومی کی وجہ سے کہیں کہیں جس سطح تک گر جاتے ہیں اس کی تاویل کچھ ایسی مشکل نہیں۔ میں صرف دانتے کی مثال دوں گا۔

اب میں آج کے موضوع کے تین الفاظ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا لفظ تو ''ہمارے'' ہے۔ میری مادری زبان پوربی ہے جسے ہمارے بزرگوں کی طرح مخدوم ومکرم ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی آج بھی پکی بولی کہتے ہیں' لیکن ادب کی سطح پر اُردو ادب میری زندگی میں پہلے آیا۔ پاکستان کی نسبت سے میں ''ہمارے ادب'' کے دائرے میں قومی زبان اُردو کے ادب کے علاوہ تمام پاکستانی زبانوں کے ادبیات کو بھی شامل کرتا ہوں۔ پشتو' پنجابی' سندھی' بلوچی' سرائیکی' شنا' ہندکو اور گجراتی وغیرہ تمام زبانوں کے ادب میں ہمیں یہ آفاقی عناصر نظر آتے ہیں کیوں کہ زبانوں کے اختلاف کے باوجود ان تمام زبانوں کے ادیب اُسی انسانی گروہ کے فرد ہیں جسے آفاقیت اپنے ورثہ کے طور پر ملی ہے۔ ان ادیبوں نے تو اِسی آفادیت کے پرچار کی خاطر زبانوں کی دیواریں بھی توڑ کر ہمیں زبان کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایسا مثبت نقطہ نظر عطا کیا ہے جس

سے آج ہم میں سے بہت سے محروم ہیں۔ سعادت یار خان رنگین اور انشا نے اُردو، فارسی، پنجابی، کشمیری، عربی اور دوسری زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ حضرت سچل سرمست فارسی میں آشکارا اور فدائی تخلص کرتے تھے، پنجابی اور اُردو میں سچل سرمست اور سندھی میں سچو۔ اقبال نے اپنے پیغام کی اشاعت کے لیے فارسی، اُردو اور انگریزی سے کام لیا۔ کاش میں تمام پاکستانی زبانوں کے حوالے سے گفتگو کر سکتا، لیکن اس باب میں خاصا عاجز ہوں، اس لیے اُردو کے علاوہ پنجابی اور سندھی شاعری کے مختصر حوالوں تک بات کو محدود رکھوں گا۔ ویسے خوشحال خاں کی عظمت سے تو ہمیں ہمارے قومی شاعر اقبال نے آشنا کرایا تھا اور اس سلسلہ کی آخری کاوشیں جناب خاطر غزنوی کا ترجمہ دستار نامہ اور جناب نعیم تقوی کی کتاب خوش حال خان خٹک اور اقبال ہے جن میں انہوں نے مسلسل مثالوں کے ذریعہ خوش حال خاں کو اقبال کا پیشرو قرار دیا ہے۔

دوسرا لفظ ''آفاقی'' ہے۔ اس اصطلاح کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کروں گا اس سے یہ بات آشکار ہو جائے گی کہ ہمارے ادب کے آفاقی رشتوں میں سب سے اہم رشتہ، بلکہ تمام رشتوں کی اساس کون سا رشتہ ہے۔

آفاق، اُفق کی جمع ہے۔ اُفق کنارے کو کہتے ہیں۔ جو کچھ زمین اور آسمان کے اطراف سے نظر آئے وہ اُفق ہے۔ ابنِ فارس کے مطابق اُفق ''کسی چیز کے اطراف و جوانب کے درمیان وسعت اور انتہائی بُعد'' کا نام ہے۔ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ انتہائی بُعد بھی ایک ہی رشتہ میں پرویا ہوا ہوتا ہے۔

قرآن پاک کی آیت ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

(حم السجدہ ۴۱: آیت ۵۳)

''ہم عنقریب انہیں اپنی آیات اُن کے گرد و نواح (دُنیا کے اطراف و جوانب) میں اور خود اُن کے نفس (ذات) میں دکھا دیں گے۔''

اس آیت سے آفاق کے معانی اپنے تمام مفاہیم کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ آفاق میں خارجی کائنات، حیاتِ انسانی، انسان کی دُنیا، قومی اور بین الاقوامی حوادث اور واقعات سب ہی شامل ہیں۔ آفاق کے اس مفہوم کے پیشِ نظر ادب کی بین الاقوامیت اور بین الاقوامی رشتے بھی اس موضوع کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس وسعت کے ساتھ ساتھ اُفق اور آفاق کے لفظ میں انتہائی وسعت اور بلندی کا جو بنیادی مفہوم موجود ہے اُسے مناسب اہمیت دینے سے ادب میں علویت اور رفعت کے نکتہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کائنات اور حیاتِ انسانی کی وسعتوں میں توازن پیدا کرنے کے لیے رَبّ المشارق والمغارب نے ایک اُمتِ وسطیٰ قائم فرمائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یہ شرف ہمیں حاصل ہوا۔ مشرق و مغرب کے اُفقوں کے درمیان جو بُعد ہے اُسے وحدت اور یکتائی میں یہی اُمت بدل دیتی ہے۔

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

(البقرہ: آیات ۱۴۳۔۱۴۲)

''اے نبیؐ ان سے کہہ دیجیے کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم بتا دیتا ہے اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک ''امتِ وسط'' بنا دیا ہے تا کہ تم لوگوں (عالمِ انسانیت) پر شاہد ہو اور رسول تم پر شاہد ہو۔''

مشرق و مغرب اللہ کا ہے۔ یہ ایک فقرہ آفاقیت اور عالم گیریت کی بنیادِ محکم ہے۔ اور پھر اُمتِ وسطیٰ کا کام یہ ہے کہ وہ عدل، توازن اور توسط پر قائم ہو اور دوسروں کو عدل و توازن عطا کرے۔ اُمتِ وسط کو اقوامِ عالم کے درمیان مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس کا فاصلہ دُنیا کی ہر قوم سے یکساں ہوگا۔ اس کا تعلق ''سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق'' ہوگا اور ''ناحق، ناروا تعلق'' کسی سے نہ ہوگا۔

یہ ہے وہ آفاقیت اور عالم گیریت جو مسلمان کو اپنے ثقافتی ورثہ کے طور پر ملی ہے۔ مسلمان کا جہاں بے حدود ہے کیوں کہ اس کا رب، ربّ العالمین ہے اور یوں وحدتِ انسانی اس کا مقصود ہے۔

قرآنِ حکیم ہمارے ادب ہی نہیں بلکہ ہماری زندگی کے آفاقی رشتوں کا سرچشمہ ہے۔ اسی چشمہ کا یہ فیض ہے کہ ہمارے لیے یہ کائنات ایک محل کی طرح ہے اور سارے مقامات، محل وقوع اور مناظر اس محل کے لاکھوں دروازوں اور کروڑوں کھڑکیوں کی طرح ہیں اور جس دروازے اور جس کھڑکی سے دیکھیے وہی صاحبِ تخلیقِ کُل نظر آئے گا۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے الفاظ میں،

ایک قصر در لک کوڑین کٹس گر کیون

جید انھن کریان پرک تیدانھن صاحب ساموہن

(محل ایک ہے۔ دروازے لاکھوں، کھڑکیاں کروڑوں، جہاں دیکھتا ہوں

وہاں صاحب یعنی محبوب کھڑا ہے) اور محبوب کا یہ جلوہ آفاقیت کا جلوہ ہے

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو دین عطا کیا ہے وہ اسلام ہے جسے عہدِ حاضر کے ذہنوں کی تفہیم کے لیے اسلامی نظریہ اور اسلامی نظامِ حیات بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ جدید ذہن مذہب کو محض عبادات تک محدود جانتے ہیں یا مغرب کی تقلید میں زندگی کی ثنویت کے قائل ہیں کہ قیصر کا حق قیصر کو دو اور کلیسا کا حق کلیسا کو۔ نظریۂ حیات اور نظامِ حیات کی اصطلاحوں کے ذریعہ ان ذہنوں تک یہ بات پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ہم سے اپنے ضابطوں کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسلامی اقدار کا آفاقیت اور ادبی تصورات و نظریات کی تشکیل سے گہرا رشتہ ہے۔ اسلام انسان کو مجبورِ مطلق نہیں مانتا۔ افلاطون اور ارسطو کے نظریۂ نقالیٔ فطرت کی جگہ ہمارا شاعر تو یہ کہتا ہے

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے

آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

اس ادبی تصور کا گہرا رشتہ قرآن کے اس ارشاد سے ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسے تمہارے لیے مسخر کیا گیا۔

قرآنِ حکیم کی ایک عظیم قدر تکریم آدم ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ

(بنی اسرائیل:۷۰)

''اور ہم نے انسان کو بحیثیت انسان عزت اور کرامت دی۔''

اسی آیت کی تفصیل، ایک ابدی بازگشت کی صورت میں خطبہ حجتہ الوداع میں ملتی ہے۔ ایام جاہلیت کے دستور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں تلے کچلے گئے۔ سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر، عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کوئی فضیلت نہ رہی۔ انسان کا مرتبہ یہ ٹھہرا کہ وہ زینت دہ بزمِ امکاں بن گیا۔ انسان تو اس آئینہ کائنات کا چہرہ ٹھہرا

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

....

کچھ آئینے سے رکھے ہوئے ہیں سرِ وجود
اور ان میں اپنا جشن مناتی ہے میری ذات

اسی قدر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسانوں کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی۔ جان، عزت اور مال کے تحفظ کے باب میں مسلم اور غیر مسلم برابر ہیں۔

اسلامی اقدارِ حیات کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ صرف اُن اقدار میں سے چند کی نشان دہی کافی ہے۔ ''انسانی آزادی'' اسلام کی ایک مستقل قدر ہے۔ انسان صرف اللہ کا عبد ہے اور اُس کے سوا کسی کی محکومی اُسے زیبا نہیں۔ اس قدر نے اردو ادب اور ہماری دوسری زبانوں کے ادبیات میں کتنے ہی اسالیب کا جامہ پہنا ہے اور طرح طرح سے اس کا اظہار ہوا ہے۔ ''حُریت'' اور ''عبدیت'' کا امتزاج صرف ہمارے ادب کی آفاقیت میں نظر آئے گا ورنہ اوروں کے لیے تو یہ ایک تضاد تھا اور ہے۔ ہمارے ہاں عبدیت، بلند تریں مرتبہ آدم کا اشارہ ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیت چمنستان کی
یہ ہستی بینا ہے، دانا ہے، توانا ہے

....

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

''تعاون'' اور ''عدل'' بھی نہایت اہم اسلامی اقدار ہیں۔ اسلامی ادب میں ہر جگہ آپ کو انسانوں کے لیے عدل کا مطالبہ نظر آئے گا اور ان اقدار کے حصول کے لیے اسلام سے وابستہ فن کار انسانوں کو تعاون، اتحاد اور عمل کا سبق دیتا ہوا نظر آئے گا۔

ان اقدار نے ایک ایسی آفاقیت کی تخلیق کی ہے جس کے تحت ہمارے فن کار نے عشق کو نورِ حیات اور نارِ حیات اور ظہور وسببِ ظہور کے طور پر پیش کیا ہے، انسان کے منصب اور عظمت کو اپنا موضوع بنایا ہے، جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر وحدتِ رب کے حوالے سے وحدتِ آدم کو اپنا نشان قرار دیا ہے۔ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی، سرائیکی اور تمام ایسی زبانوں میں جن میں مسلمانوں کا تخلیق کردہ سرمایۂ ادب ملتا ہے یہ آفاقیت فنی محاسن اور شدید داخلی تجربے کے طور پر اُبھری ہے۔ وہ شدید داخلی تجربہ جو باہر کی دُنیا کو فتح کرتا ہوا ایک انسان کے دل کی شمعِ آرزو کو دوسرے دلوں میں روشن کر دیتا ہے۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
(میرؔ)

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گُل، میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم
(اقبالؔ)

عشق جھاں دی ہڈین پینڈا
سوئی نرجیوت مرجاندا

(بلّھے شاہ)

عشق فعل ہے رب دی ذات فاعل، عاشق اوسدے سبھ مفعول میاں
ہیسی عشق ظہور ہے، عشق سارا عشق ہوسیا سدا معمول میاں

(وارث شاہ)

جی تون بیت پائین' سی آیتوں آھین
نیومن لائین' پریاں سندی پردی

(شاہ عبداللطیف بھٹائی)

محبت کی جہتیں کس طرح بلّھے شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، وارث شاہ، میر اور اقبال کے کلام میں ایک دوسرے کا ضمیمہ بن کر ہماری راہیں منور کرتی ہیں۔ عشق سببِ ظہور ہے، عشق آدمی کے وجود کا عنصر بن جاتا ہے، عشق تو ہڈیوں کو گلا کر آدمی کی خاکستر سے نئے آدمی کو وجود میں لاتا ہے، عشق خدا کا فعل ہے، (عشق خدا کا کلام۔ اقبال) اور عشق ہی کلامِ شاعر کو آیاتِ قرآن کا عکس بنا کر محبوبِ حقیقی سے ملانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

اسلامی نظامِ فکر اور اقدار ہماری زبانوں کے ادب کی اساس اس طرح بنیں کہ ''زمین'' کہیں ان آفاقی تصورات پر غالب نہ آ سکی۔ ہمارے ایک نقاد نے اُردو شاعری کے مزاج اور تاریخ کو زمین کی رسیوں سے جکڑ دیا ہے۔ یہ ایک جزوی صداقت ہے جو جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی حساس شاعر اپنے عہد، اپنے گردوپیش کے طبعی ماحول اور رسم و رواج سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اُردو غزل اور شاعری پر فارسی اثرات غالب رہے، لیکن بعد میں اُردو غزل کی زبان اور فضا خاصی حد تک فارسی کی گرفت سے آزاد ہوگئی۔ ہماری غزل اور شاعری پر ہندی اثرات اور برِ عظیم کے واقعات نے اثر ڈالا۔ اُردو کے علاوہ پنجابی، سندھی اور دوسری زبانوں کی شاعری میں بھی ہمیں

مقامی اور ہندی موسم، تہوار اور رسوم نظر آتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندو مذہب کی اصطلاحیں اوّل اوّل اُردو میں فارسی کے وسیلہ سے آئیں جیسے دیر، بت کدہ، برہمن، لیکن بعد میں مذہبی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ اُردو اور پنجابی شاعری میں زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق الفاظ بھی ہندی ذریعوں سے آئے۔ دکنی اُردو اور پنجابی شاعری میں تو نازک حقیقتوں کا اظہار شعراء نے عورت کی زبانی کیا ہے اور اس میں ریختی کی معکوسیت نہیں۔ یہ ہندی اثرات اُردو شاعری کے بارہ ماسہ اور پنجابی شاعری کے اٹھوارہ اور باراں ماہ میں نظر آتے ہیں۔ اُردو شاعری کے اسالیب، تشبیہ واستعارہ میں بھی یہ اثرات نظر آتے ہیں۔

زلف ہے تیری موج گنگا کی
تل نزیک اس کے اک سناسی ہے

(ولی)

کب تلک دھونی جمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا

(میرؔ)

لیکن یہ اُردو اور پاکستانی زبانوں کی شاعری کا صرف ایک چھوٹا سا گوشہ ہے۔ ہمارے ادب اور شاعری میں عربستان، ترکستان، وسطی ایشیا، ایران اور دوسرے ملکوں کی تلمیحات اسالیب، مقامات اور اشیا کا ذکر انسانی جذبات کی آفاقیت کے ساتھ ساتھ نمایاں تر ہے۔ برعظیم میں مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ اس حقیقت کی شہادت ہے۔ اسلام ہر ملک اور ہر دور میں مسلمانوں کی قومیت کی اساس رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مختلف ادوار اور ممالک کے مخصوص تقاضوں کے پیش نظر اُس کے ثقافتی اور خارجی مظاہر مختلف رہے ہیں۔ مسلمانوں نے ہر ملک اور اپنی تاریخ کے ہر دور میں اُن مقامی عناصر کو اپنے نظامِ زندگی میں جگہ دی ہے جن کا اُن کی دینی اقدار اور آفاقی تصورات سے ٹکراؤ نہ رہا ہو۔ ہولی کے گیت اُردو شاعروں نے لکھے ہیں۔ مسلمانوں نے ہوری کو ایک نیا ذہنی تہوار بنا دیا اور ہولی

کے رنگوں میں اللہ کے صفاتی رنگ شامل کر دیئے۔ حضرت بلّھے شاہ کی ہوری پنجابی آمیز اُردو ہی میں لکھی گئی ہے۔

ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللہ
نام نبی کی رتن چڑھی بوند پڑی اللہ اللہ
رنگ رنگیلی اوہی کھلا دے جو سکھی ہووے فنا فی اللہ
ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللہ
الستُ بربکم پیتم بولے سب سکھیاں نے گھونگھٹ کھولے
قالو بلیٰ ہی یوں کر بولے لا اِلٰہ الا اللہ
ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللہ
نحن اقرب کی بنسی بجائی من عرف نفسہ کی کوک سنائی
ثم وجہ اللہ کی دھوم مچائی وچ دربار رسول اللہ

یہ ہمارے ادب کے آفاقی رشتوں کی قوت ہے کہ ہوری کی فضا ہی بدل گئی۔ خود ہمارے عہد میں نگار صہبائی کے گیتوں کی فضا کو میں اسلام رنگ اور اسلام رس کہتا ہوں۔ جمیل الدین عالی کے ابتدائی دوہوں میں ہندی دوہوں کی شدید جنسیت کی جھلک بعد میں گویا پاکستانی کا نقش بن گئی۔ برِعظیم کے اسلامی فن تعمیر میں عجم کے "حسنِ طبیعت" عرب کے "سوزِ دروں" کے ساتھ برعظیم کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ متحدہ ہندوستانی قومیت کے داعی ڈاکٹر عابد حُسین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور مجموعی طور پر یہ دعویٰ درست ہے کہ مسلمانوں نے عربی ایرانی اور ہندوستانی عناصر کو اپنے دینی اجتماعی اور ثقافتی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فن تعمیر میں ہم آہنگ کر دیا۔ یہی عمل ہمیں برعظیم کے دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی نظر آتا ہے، مگر ہمارے بعض نقاد صرف دھرتی سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش میں اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ بعض دوسرے نقادوں کے نزدیک "کوہ طور" "فاران" "جیحوں" "دجلہ" "فرات" کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ

ہماری شاعری کا گرد و پیش کی زندگی سے کوئی علاقہ نہ تھا اور اگر تھا بھی تو ایک کم زور سا رشتہ۔

یہ حضرات ایک واضح تاریخی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، یعنی اس عہد کے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کا باہمی رابطہ اور رشتہ۔ مسلمانوں کی برادری ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی جس کو اپنی مشترک روایات و اقدار عزیز تھیں۔ تاریخ کے اوّلین ادوار میں ہر قوم اپنی ایک ''دیومالا'' مرتب کر لیتی تھی تاکہ اُسے اپنی وحدت کے لیے استعمال کیا جائے۔ مسلمانوں کو دیومالا کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ تو خود تاریخ کا عہدِ نو ہیں۔ اُن کی تاریخ اور روایات و اقدار نے دیومالا کی جگہ لے لی اور یہی روایات و اقدار اُن کی زندگی کے آفاقی رشتوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادب بھی زندگی کا گوشہ ہے بلکہ زندگی کا لبِ اظہار...... اسی لیے یہ آفاقی رشتے ہمارے ادب کی قدر بن گئے یا یہ قدریں ہمارے ادب کے آفاقی رشتوں کی اساس بن گئیں۔ یہ حقیقت دو پہلو ہے اسی لیے دونوں طرح کہی جا سکتی ہے۔

پھر ''طور'' ''فاران'' ''دجلہ و فرات'' اور ''کربلا'' صرف مقامات ہی نہیں...... یہ تو آفاقی حقیقتوں کے استعارے اور اشارے ہیں۔

گرچہ ہے تابناک ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
قافلۂ حجاز میں ایک حُسین بھی نہیں

(اقبال)

وہ رن مجھ میں پڑا ہے خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اک کربلا ہوں

(سلیم احمد)

حیات عرصۂ کرب و بلا میں گزری ہے
تمام عمر ہوئی ہیں شہادتیں کیا کیا

(لیث قریشی)

''فاران''، تکمیل ہدایت کا اشارہ ہے اور کوہ طور ظرفِ نظر کا۔ ان اشاروں کی اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کے اطراف و جوانب کا احاطہ مستقل مضامین کی صورت میں کیا جائے۔

(۳)

ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اسلامی اقدار کو اپنے شہ کاروں اور کلام میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ آفاقی حقیقتوں کے ذہنی مظہر کی طرح اُبھری ہیں' اور ان میں روحِ عصر کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ انسان وحی الٰہی کی روشنی میں جو راستہ آسانی سے پا سکتا ہے جب اپنی محدود عقل کی روشنی میں اُسے تلاش کرتا ہے تو خسران کی صدیوں میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے چودہ سو سال سے پہلے آفاقیت اور وحدتِ آدم کا پیغام دیا تھا' اور انسان آج بیسویں صدی کے اختتام پر صرف بین الاقوامیت تک پہنچا ہے

مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
''جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟''

اقدار کے سلسلہ میں خود اُن کی معنویت' قدر اور حیاتِ انسانی میں اُن کی اہمیت کے سوال اُبھرتے ہیں۔ اسلامی اقدار کا تعلق حیات و کائنات' مقصدِ تخلیق' کائنات میں انسان کے مرتبہ اور اس کے اخلاقی خصائص' صداقت' خیر اور حُسن کے علاوہ عدل عمرانی' فرد اور معاشرہ کے رشتے جیسے سوالات سے ہے۔ یہی وہ سوالات ہیں جن کا صحیح جواب نہ ملنے کی وجہ سے ایک طرف انسانی معاشرہ عدل و توازن کے لیے ترس رہا ہے اور دوسری طرف فکر و فن کی راہیں دھندلا گئی ہیں۔ آج کی شاعری اور ادب میں لایعنیت کا احساس نمایاں ہے۔ خیال اور اظہار کے درمیان منطقی رشتہ کو توڑنے کی کوششیں ادبی تحریکوں کا درجہ حاصل کر چکی ہیں (DADAISM)۔ اعلیٰ ادب' خدا' حیات اور کائنات کے درمیان سہ جہتی مکالمہ ہوتا ہے۔ آج کا ادب جو آفاقی اقدار سے لاتعلق ہے' خود کلامی اور وہ بھی غیر مربوط بن کر رہ گیا ہے۔

ہماری قدروں کا جن موضوعات و مسائل سے تعلق ہے اُن کی طرف سے اس سے پہلے پیراگراف میں اشارہ کیا گیا۔ضروری ہے کہ جدید ادب میں ان کے اظہار کا جائزہ لیا جائے۔ میں اپنے آپ کو حتی الامکان غزل اور بڑی حد تک آج کی پاکستانی غزل تک محدود رکھتے ہوئے چند مثالیں پیش کروں گا۔ یہ مثالیں میرے معروضات کی دلیل بھی ہیں اور ان سے ہمارے ادب کے آفاقی رشتے اور ادب کی آفاقی نوعیت بھی واضح تر ہو سکے گی۔طوالت کی وجہ سے تبصرے سے گریز کروں گا' ہاں ربطِ کلام کے لیے چند اشارے کرتا چلوں گا۔

انسان کا مزاج' اس کی اخلاقی حس' غیرت' کائنات میں اپنے مرتبہ اور فرائض کا احساس۔ یہ آفاقی فکر اور اقدار کے بنیادی نکات ہیں۔انسانی غیرت اور عظمت کی کتنی توانا تصویر میر صاحب نے پیش کی ہے

آبِ حیات وہی نا' جس پر خضر و سکندر مرتے تھے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ' یہ بھی ہماری ہمت ہے

یہ خیال ہماری شاعری کی رگوں میں لہو کی طرح گردش کرتا رہا ہے۔اقبال کے ہاں اس کا اظہار یوں ہوا ہے

گدائے مے کدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

انسان تو موت کو زندگی نو کا دیباچہ بنا دیتا ہے۔ زندگی کا تسلسل اُس کے دم سے ہے۔ یہ اُس کی ہمت کا اعلیٰ تر مقام ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر
(میرؔ)

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

(اقبالؔ)

موت کو ماندگی کا وقفہ کہنے اور چشمہ حیواں پر پہنچ کر سبو توڑنے والی یہ مخلوق درِ کسریٰ سے بیزار ہے۔ سامراج اُس کے لیے تاریخ کا ایک کھنڈر ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو تلاش کر کے تاریخ کے دھارے کے موڑ دیا ہے اور آج اس کے ہونٹوں پر یہ بول ہیں۔

درِ کسریٰ پہ صدا کیا کرتا
اک کھنڈر مجھ کو عطا کیا کرتا

اپنے آپ کو تلاش کر لینے والا انسان آج بھی اپنی تلاش میں مصروف ہے۔ یہ تلاش کوئی کنارا، کوئی پایان نہیں رکھتی۔ اپنی تلاش میں اس کے تبصرے اور خود کلامی آفاقی شعر و ادب کے بہترین حصوں میں شامل کی جا سکتی ہے۔ اُردو شاعری میں اس کا سلسلہ بہت دُور تک پھیلا ہوا ہے۔

میں کون ہوں اے ہم نفساں! سوختہ جاں ہوں
مخلوق ہوں یا خالق مخلوق نما ہوں

(مصحفی)

میر و مصحفی سے لے کر سراج الدین ظفر، رئیس امروہی، جمیل نقوی اور آج کے بیشتر شعراء تک۔ یہ بات کچھ کم اہم نہیں کہ ایسی بیشتر غزلیں مسلسل ہیں۔

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں
وہیں سُولی پہ لٹکایا گیا ہوں

(رئیس امروہوی)

ہیچ ہوں لیکن مہ و خور ہیں مرے زیرِ نگیں
کچھ نہیں لیکن دو عالم زیرِ پا رکھتا ہوں میں

(سراج الدین ظفر)

ازل سے ہوں تلاش میں خود اپنے ہی وجود کی
میں نغمۂ الست کی صدائے بازگشت ہوں

(جمیل نقوی)

یہ شاعری عظمتِ آدم کی ترانہ بار شاعری سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں آدمی نامہ کا سا تضاد بھی ہے اور ذہنِ غالب کے سے سوالات بھی۔

اپنی تلاش میں مصروف اور مبتلا انسان کا ہر راستہ اس کے معبود کی طرف سے ہو کر نکلتا ہے اور اس کے معبود تک جاتا ہے۔ آج کی اُردو غزل میں خدا سے تخاطب کا لہجہ ہماری شاعری کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ خدا سے قربت کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آدمی اپنے آپ سے بیگانہ ہو جائے

ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے، تُو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

(اصغر گونڈوی)

لیکن آج کا شاعر روشن تاریکیوں کے عہد میں سانس لے رہا ہے۔ وہ شدت کے ساتھ خدا کے اظہار کی دُعا کرتا ہے اور اُس سے وہ روشنی طلب کرتا ہے جو فریب نہ ہو اور یک روزہ نہ ہو

اتنی شدت سے ظاہر ہو
اندھوں کو بھی سُجھائی دے

(سلیم احمد)

معبود کوئی تو روشنی دے
ہر روز دیا بدل رہا ہے

(رضی اختر شوق)

جدید پاکستانی غزل لایعنیت، جسم کی تنگنائے اور چند روزہ تجرید کے عہد سے نکل کر آفاقیت اور

آفاقی سوالوں اور جائزوں کے عہد میں دوبارہ داخل ہو چکی ہے۔آج کا شاعر سچ کو زندگی کا وہ دریچہ سمجھتا ہے جس سے ماہ وسال کے مُحبس میں تازہ ہَوا آتی ہے، وہ اپنے چہرے کو دیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے، اُسے بے پیرہن رُوحوں کو پرکھنے کا سلیقہ اور کمال بھی آتا ہے، کمال اور سلیقہ یوں کہ جسم تو سراپا لباس ہے

میں سوچتا ہوں کہ سچ کب تلک نہ بولیں گے
گھٹن بڑھے گی تو خود ہی دریچہ کھولیں گے

(سلیم کوثر)

ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج
آنکھیں بھی ہیں، چراغ بھی ہے، آئینہ بھی ہے

(اقبال عظیم)

ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں پرکھا تو اُن کی روح
بے پیرہن تھی، جسم سراپا لباس تھا

(مجید امجد)

انسانی زندگی اور مسائل کے اِن آفاقی گوشوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی شاعر اور ادیب زمان و مکان کے مسائل سے بھی نبرد آزما ہے کہ یہ مسائل اُس کی میراث ہیں اور یہ مسئلے تقدیرِ انسانی سے وابستہ ہیں

یہ لمحۂ موجود کہ تم جس میں ہو زندہ
ٹوٹا ہوا پتہ ہے زمانے کے شجر سے

(اُمید فاضلی)

فنا کی چال کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی
بساطِ دہر سے اُلجھے حساب داں کیا کیا

(امجد اسلام امجد)

یہ اشعار محض مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ورنہ حامد عزیز مدنی‘ منیر نیازی‘ تابش دہلوی‘ شاعر لکھنوی‘ قصری کانپوری‘ نازش حیدری وغیرہ سے لے کر کشور ناہید‘ پیرزادہ قاسم‘ ثروت حسین‘ محمد اجمل نیازی‘ پروین شاکر اور شاہدہ حسن وغیرہ تک ان آفاقی رشتوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ نام بھی مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ پھر‘ ہمارے ادب کے آفاقی رشتوں کا یہ مطالعہ صرف شاعری کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آفاقیت کے ایک پہلو یعنی بین الاقوامی تحریکاتِ حریت سے اپنے ادب کے رشتہ کو بھی دائرۂ مطالعہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہ موضوع ایک کتاب کا مطالبہ کر رہا ہے اور بشرطِ فرصت و زندگی اس مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کے ہاں یہ آفاقیت‘ بعض نئے ادبی تجربوں کی طرح صرف فیشن یا مغرب کی نقالی کی بات نہیں۔ یہ آفاقیت اُن کے باطن سے اُبھر کر لفظوں کے پیکر اور لباس میں ڈھلتی ہے اور اس پیکر اور لباس کے رنگ تتلی کے پروں کی طرح حسین اور زندگی کی طرح انمٹ ہیں۔ یہ سچے موسم کے سچے رنگ ہیں۔ اطہر نفیس نے اس حقیقت کو کس طرح اپنی گرفت میں لیا ہے۔

خود اپنے ہی باطن سے اُبھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر

استفادات

۱۔معارف القرآن۔ مفتی محمد شفیع مرحوم

۲۔تفہیم القرآن۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

۳۔لغات القرآن۔ مولانا عبدالرشید نعمانی

۴۔لغات القرآن۔ چوہدری غلام احمد پرویز

۵۔کلیاتِ بُلھے شاہ۔ مطبوعہ پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور

۶۔مقالاتِ تقریباتِ شاہ عبداللطیف بھٹائی۔۶۰۔۱۹۵۹ء

۷۔ہیر وارث شاہ مطبوعہ جے ایس سنت سنگھ لاہور

۸۔Dictionary of World Literature

Edited by Shipley,J.T

۹۔The Sublime by Mork,S.H

۱۰۔اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک۔ سیّد ابوالخیر کشفی

ادب اور قومی شعور

''عالم میں خاک کی طرح تحمل پیدا ہو جاتا ہے۔ تکبر کا نشان بھی نہیں رہتا۔ علم جیسے جیسے زیادہ ہوتا ہے۔ اللہ کا خوف' تواضح اور انکسار زیادہ ہوتا جاتا ہے۔''

ادب کے نظریہ سازوں کو اس بات پر اعتراض رہا ہے کہ ''ادبی تنقید کے نام پر ایسے مطالعے زیادہ پیش کئے گئے ہیں جن میں خارجی اور بیرونی معیاروں سے ادب کو پرکھا گیا ہے اور یہ مطالعے تاریخِ تہذیب کے مطالعے ہیں۔ ادب کو اس طرح تہذیب کی تاریخ سے ہم رشتہ کرنا' ادب کے مخصوص میدان اور ادبی مطالعے کے مخصوص طریقوں سے انکار کرنے کے برابر ہے۔(۱) لیکن اس نظری اعتراض کے باوصف یہی نظریہ ساز ادب کے وظائف کا مطالعہ کرتے ہوئے تاریخی عوامل' مختلف قوموں کے مزاج اور قومی شعور اور مختلف ادوار کے ذکر پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ادب ایک سماجی عمل ہے۔ ادب کے وسیلے سے مختلف سماجوں اور معاشروں نے اپنے مجموعی اندازِ فکر' مختلف رویوں' اپنی شناخت اور اپنے شعور کا اظہار کیا ہے۔ ادب کو ہر مہذب معاشرہ نے صرف گہری توجہ کا مستحق ہی نہیں سمجھا بلکہ ادب کے آئینے میں اپنے بطون کو تلاش کیا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اعلیٰ ادب آفاقی ہوتے ہوئے بھی قومی ہوتا ہے۔ وہ کسی قوم کی اقدار کا تخلیقی اظہار ہوتا ہے اور کسی خاص دور کے اندازِ فکر کی نہایت معتبر شہادت ہوتا ہے۔ ایسی شہادت کہ دوسری تاریخی دستاویزیں اس کی جگہ نہیں لے سکتیں' کیونکہ ان دستاویزوں میں انسانی شعور اور لاشعور کی آویزش' فرد اور معاشرہ کی ایسی کشمکش، عمل اور ردِ عمل کا ایسا سلسلہ نہیں ملتا جس سے ادب عبارت ہے۔

میں تو یہاں تک عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ جس ادب میں اپنے عہد کے فکری اور جذباتی خدوخال نظر نہ آئیں' جس ادب میں اپنے دور کی کشمکش کے مختلف دائرے اور

زاویئے نہ ملیں وہ آفاقی نہیں بن سکتا۔ شیکسپیئر کے ڈرامے جن میں اقبال کے خیال کے مطابق فطرت نے اپنا نظارہ آپ کیا ہے۔ اپنے عہد کے انگلستان کے رجحانات کے مرقع بھی ہیں۔ ان ڈراموں میں اس عہد کے توہمات اور تعصبات انسانی زندگی کے رنگوں کا روپ دھار کر سامنے آتے ہیں۔ فردوسی کے شاہنامہ میں وطنیت اور انسان دوستی کی کشمکش، آمیزش اور آویزش دیدنی ہے۔ دانتے کی آفاقیت کے جلو میں ہمیں عیسائیت کی اعلیٰ اقدار نہیں بلکہ قرونِ وسطیٰ کی عیسائیت کا جہل بھی نظر آتا ہے۔ میر تقی میر آج بھی ہمارے جذبوں کی زبان ہیں مگر وہ برصغیر کی اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے آغاز کے مختلف عصری دھاروں کے شارح بھی ہیں۔ میں نے سمجھ بوجھ کر مختلف زبانوں اور مختلف ممالک وادوار کی یہ مثالیں آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ ان مثالوں سے میرا مقصد محض یہ نکتہ پیش کرنا ہے کہ آفاقی ادب میں ایک طرف انسانیت کی اعلیٰ اقدار ملتی ہیں اور دوسری طرف فن کار کی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یہ فن کار فرد ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قوم کا رکن اور حصہ ہوتا ہے اور اس حد تک کہ اپنے ادراک اور احساس کی بنا پر اس قوم کے اجتماعی شعور اور رجحانات کی زبان بن جاتا ہے۔ یہ ادب کی تین سمتیں اور جہتیں ہیں۔ ادیب کے لئے زبان کا لفظ میں نے استعارہ کے طور پر استعمال کیا، اور اسی کے ساتھ یہ نکتہ میرے ذہن میں ابھرا کہ زبان ادیب کا وسیلہ ہے اور زبان عہد بہ عہد ان مسلسل تبدیلیوں، ان فکری دھاروں اور ان تاریخی اثرات کو ناپنے کا پیمانہ ہے جن سے کوئی قوم دوچار ہوتی ہے۔ ''زبان میں تاریخی حادثے، یادیں اور روابط ہوتے ہیں۔ ادبی زبان تعبیری اور متضمن (connotative) ہوتی ہے۔(۲)۔ بات یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ ادبی زبان صرف حوالہ جاتی نہیں ہوتی۔ اظہار اس کا اہم پہلو ہے۔ یہ اظہار صرف فن کار کی ذات تک محدود نہیں بلکہ قومی مزاج اور تاریخی عوامل سے ہر زبان کے اپنے اسالیبِ اظہار وضع ہوتے ہیں جو لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ان کی قوم کے لہجوں اور رویوں کا احاطہ کرتے ہیں اور قاری کے رویئے کو متاثر کرتے ہیں۔ یوں بات کسی قوم کی اقدار اور نظریات تک پہنچ جاتی ہے۔ قومی شعور انہیں اقدار کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ اقدار، قومی

شعور کی رہنمائی کرتی ہیں، قومی شعور ان اقدار کو مستحکم کرتا ہے۔ ادب ان اقدار اور شعور کا اظہار کرتا ہے اور انہیں ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرتا ہے اور یوں قومی تاریخ کو ایک تسلسل عطا کرتا ہے۔ مختلف قومی ادبوں کے تسلسل سے انسانی تاریخ اور تہذیب کے تسلسل تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔

قومی شعور کے سلسلہ میں، میں نے افراد کا ذکر کیا ہے۔ یونان کی شہری ریاستوں میں بھی ہمیں مختلف طبقے نظر آتے ہیں۔ بعد میں قوموں اور ریاستوں کے دائرے وسیع تر ہوتے گئے۔ ایک ہی قوم میں ایک ہی وقت میں مختلف خطوں میں تہذیبی اور ثقافتی فرق نظر آنے لگے لیکن اس کے باوجود قومی شعور اور قومی ثقافت کی وحدت کبھی مشکوک نہیں رہی۔ مختلف علاقائی دھارے ایک بڑے دھارے میں گم ہو جاتے ہیں جسے ہم قومی شعور قرار دیتے ہیں۔ اس بات میں اس وقت تک خلل پیدا نہیں ہوتا جب تک وفاداریوں کا صحیح تناسب اور ترتیب برقرار رہے۔ چین، امریکہ اور روس جیسے بڑے ملکوں میں مختلف علاقائی تہذیبیں موجود ہیں مگر یہ سب رنگ مل کر اس قوس وقزح کو جنم دیتی ہیں جسے ہم چینی یا امریکی یا روسی ادب، ثقافت اور شعور کہتے ہیں۔ امریکہ تو مختلف ثقافتوں کا سنگم رہا ہے اور آج بھی امریکی اپنی جڑوں کی تلاش میں آئرلینڈ، جرمنی، انگلستان اور ایسے ہی دوسرے ملکوں کا رخ کر رہے ہیں، مگر اپنی امریکیت کی نفی کے بغیر۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں قومی تشخص، قومی شعور، قومی کلچر اور قومی ادب کے مسئلہ کو یا تو سیاست دانوں نے اپنے اغراض کے تابع بنا لیا، یا ایسے دانش وروں نے اپنی تاویلوں سے اسے الجھا دیا جن کی بصیرت، اندازِ نظر اور علم، مانگے کا اجالا ہے۔

۔۲۔

آج کے مُلکی اور قومی سیاق وسباق کے پیش نظر قومیت اور اس کے متعلقہ پہلوؤں پر چند باتیں اس مقالے کے آخری حصہ میں پیش کی جائیں گی۔ قوم کے عناصرِ ترکیبی کے بارے میں بھی اسلامی نقطہ نظر کی نشان دہی بھی اس مقالے کے حدود میں شامل ہے۔ مقالے کے دوسرے حصے میں میں برصغیر کی مسلم قوم کے قومی شعور اور ادب سے اس رشتہ کے بارے میں

گفتگو مقصود ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ''پاکستان اسی دن عالم وجود میں آ گیا تھا جب پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا۔'' اس بلیغ جملہ کے اجمال میں مسلم قومیت کی ساری تفصیل موجود ہے۔ کلمہ طیبہ' ایک نظریہ ہے۔ ایسا نظریہ جو حیات و کائنات کے بارے میں آدمی کے نقطہ نظر کو بدل دیتا ہے۔ ایسا نظریہ جو فطرت پرستی کی جگہ آدمی کو تسخیر فطرت کے منصب پر فائز کر دیتا ہے' ایسا نظریہ جو خون کے تمام رشتوں کو توڑ کر آدمی کا رشتہ ایک نئی برادری سے قائم کر دیتا ہے۔ نظریہ اور اقدار کی بنا پر قائم ہونے والی عالمگیر برادری مسلمان جب اس برعظیم میں فاتح کے طور پر آئے تو ان کے لئے اپنے جداگانہ تشخص کو برقرار رکھنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ شاید ہی کسی فاتح قوم کے سامنے یہ مسئلہ اس شدت کے ساتھ آیا ہو۔ البیرونی نے کتاب الہند کی تمہید میں لکھا تھا:

''ہندو ہم سے ہر بات میں مختلف ہیں...... وہ مسلمانوں کو ناپاک قرار دیتے ہیں اور ان کے ساتھ ہر رشتہ ممنوع جانتے ہیں۔ (۳)

البیرونی نے اس اختلاف کو محض لباس اور رسم و رواج کی سطح پر نہیں دیکھا بلکہ فکر' عقیدہ اور اداروں کی سطح پر دیکھا اور پیش کیا ہے۔

''ہم مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سب انسان برابر ہیں سوائے تقویٰ کے...... اور یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی تفہیم بھی ختم کر دیتی ہے۔ (۴)

البیرونی نے گیارہویں صدیٔ عیسوی میں جو حقیقت بیان کی تھی اسے بیسویں صدی کے نصف اول میں قائداعظم محمد علی جناح نے عہدِ حاضر کی سیاسی زبان میں یوں پیش کیا۔

''اسلام صرف ایک مذہبی عقیدہ نہیں' بلکہ وہ ایک عملی اور حقیقت پرستانہ قانونِ حیات ہے جس کا تعلق زندگی کی ہر اہم چیز سے ہے۔ ہماری تاریخ' ہمارے ہیرو' ہمارے فنون' ہمارا فنِ تعمیر' ہماری موسیقی' ہمارے قانون اور اصولِ قانون سب اس کے تابع ہیں۔ ان تمام چیزوں

میں ہمارا نقطہ نظر ہندوؤں سے صرف بنیادی طور پر مختلف نہیں بلکہ اکثر صورتوں میں متحارب اور متصادم ہے۔"(۵)

کم و بیش ایک ہزار سال کے زمانِ حکمرانی میں مسلمان قوم نے برعظیم پاک و ہند کو ایک سیاسی اور جغرافیائی وحدت بنا دیا اور اسے "ہند" کا نام دیا۔ اس سے پہلے مختلف علاقے مختلف ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ تاریخ کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ مسلمانوں کے عطا کردہ اتحاد ہی کو ان کے نظریۂ قومیت کے خلاف ایک دلیل کے طور پر پیش کیا گیا۔ مسلمانوں کا یہ کارنامہ بہت بڑا ہے لیکن اس سے بڑا کارنامہ اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کی سعی مسلسل ہے۔ اس جدوجہد کا سب سے نمایاں اور تخلیقی اظہار اس ادب میں ہوا ہے جو اس طویل مدت میں مسلمانوں نے برعظیم کی مختلف زبانوں میں پیش کیا اور بالآخر اس تشخص کا قوی تر اظہار اس زبان اور اس کے ادب کے ذریعے ہوا جسے آج ہم اردو کہتے ہیں اور جسے اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف نام دیئے گئے۔ زبان ہند، ہندی، ہندوی، ہندوستانی، ریختہ وغیرہ۔

مسلمانوں کو اپنے نئے دیس سے بڑی مُحبت تھی لیکن انہیں اپنا قومی وجود عزیز تر تھا۔ برعظیم میں انہوں نے جو ادب تخلیق کیا اس میں یہاں کی زمین کی خوشبو ہے، موسموں کی رنگارنگی ہے، پرندوں کا ذکر ہے، گنگا جمنا کی موج سامانی کا نظارا ہے۔ مگر وہ گیسوئے دجلہ و فرات کی تابناکی، بہار کی جلوہ سامانی اور اپنی بین الاقوامیت کو نہ بھول سکے۔ ہندوستان ان کا ٹھکانا تھا مگر اسلام کی دولتِ مشترکہ کی رُکنیت ان کی اصل قوت تھی۔ عہدِ سلاطین سے لے کر عہدِ مغلیہ تک ہجرت کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ مختلف اسلامی ملکوں کی جغرافیائی حدود قابلِ احترام تھیں لیکن یہ حدود اسلام کے بیٹوں کے راستے کی رکاوٹ نہ بنیں۔ ہماری تاریخ کے کتنے ہی عالم، درویش، صاحبانِ کمال، ادبا و شعراء اور صاحبانِ سیف و علم مختلف مسلمان ملکوں سے یہاں آئے اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

شعر و ادب کی دنیا میں مسلمانوں کا رشتہ اصل سے کبھی نہیں ٹوٹا۔ قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی، وغیرہ یہ سب اصناف فارسی سے اردو اور دوسری زبانوں میں آئیں۔ سندھی اور پشتو کے علاوہ

بنگلہ زبان کے دامن میں بھی غزل کی دولتِ بیدار موجود ہے۔ ہماری بیشتر زبانوں کا رسم الخط ہمارے اسی اتحاد کی کہانی ہے۔ اگرچہ فارسی سے یہ رشتہ ادبی سطح پر قوی تر ہے لیکن جہاں تک افکار کا تعلق ہے عربی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خود مسلمانوں کے عہد میں فارسی زبان نے عربی اور اسلامی افکار و تصورات کو اپنی اساس بنالیا' اگرچہ ان میں عجمی اور غیر عربی عناصر بھی شامل ہو گئے۔ مسلمانوں نے ہندی کے مختلف روپ بھاشاؤں میں بھی ادب تخلیق کیا اور ان میں اپنے افکار کے بیج یوں بوئے کہ خود غیر مسلم شاعر متاثر ہوئے۔ (۶)

۱۷۰۷ء کے بعد مسلمانوں کے قومی تشخص کے مسئلہ کی نوعیت بدل گئی۔ غیر ملکی سامراج ۱۸۵۷ء تک تجارت کا لبادہ اوڑھے رہا اور پھر استبداد نے یہ لبادہ بھی اتار پھینکا۔ اس دور میں مسلمانوں کا ادب بالخصوص اردو ادب ان کے قومی تشخص کے اظہار کا نہایت قوی وسیلہ بنا۔ یہ صورتِ حال قیام پاکستان تک برقرار رہی اور آج بھی مجموعی طور پر اسے حقیقت کا درجہ حاصل ہے۔ اردو کو رابطہ اور ضرورت کی زبان کہا جا رہا ہے۔ اس نچلی سطح پر بھی یہ بات درست ہے' لیکن بلند تر اور تخلیقی سطح پر اردو زبان مسلمانوں کے قومی تشخص کی ایک علامت ہے۔ مختلف علاقوں کے مسلمانوں نے اپنی مادری اور علاقائی زبانوں کی جگہ اردو کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے ربع اول تک سندھ' بلوچستان' سرحد اور بنگال کے چھوٹے بڑے شہروں میں اردو مشاعرے ہوتے تھے اور ان علاقوں کی علاقائی زبانوں کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر شاعر ایسا ہو جس نے اردو میں بھی شاعری نہ کی ہو۔ بنگال میں اردو کو نبی جی بھاشا کہا گیا۔ اردو اور اسلامی ثقافت اور جداگانہ قومی تشخص کی کارفرمائی اتنی گہری رہی ہے کہ خود ان علاقائی زبانوں کا مسلم روپ الگ ہے۔ بنگلہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا ادبی اظہار اور لغت (Diction) مختلف ہے۔ یہی بات اور زبانوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ میں نے پنجاب کی مثال دانستہ نہیں دی ہے' کیونکہ انیسویں صدی کے آخر سے پنجاب کے مسلمانوں کی ثقافتی اور ادبی زبان بنیادی طور پر اردو ہے۔ آج ہماری زبان کا سکۂ رائج الوقت اقبال ہے۔ آج ایشیا اور افریقہ کے نہایت

پیچیدہ مسائل میں زبان کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں زبان کے سیاسی استحصال کا بڑا حصہ ہے۔ ہندوستان میں بھی علیحدگی کی تحریکوں کا لسانی پہلو سب سے نمایاں ہے۔ اس پس منظر میں شاید ہی کسی اور انسانی گروہ کی ایسی مثال پیش کی جا سکے جس نے پنجابی مسلمانوں کی طرح اپنی علاقائی زبان پر ایک اور زبان کو ترجیح دی ہو۔ اس سے کسی قدر کم تر پیمانے پر یہی بات سرحد اور بلوچستان کے بارے میں بھی درست ہے جہاں کی صوبائی اسمبلیوں نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا۔ سندھ میں بھی اردو کو تخلیقی سطح پر اظہار کے لئے استعمال کیا گیا۔ عہد حاضر کے سب سے بڑے سندھی شاعر شیخ ایاز کا اردو مجموعۂ کلام ان کے سندھی مجموعۂ کلام سے پہلے شائع ہوا۔ پیر حسان الدین راشدی اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے کام کا نہایت مؤقر حصہ اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔

اس جائزہ میں میں نے تفصیل اور تاریخی تسلسل سے کام نہیں لیا ہے مگر سندھ اور مختلف علاقوں کے اردو مشاعروں کا ذکر سطورِ گزشتہ میں کیا گیا۔ اردو کو تو سچل سرمست کے ذریعۂ اظہار بننے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اسی طرح مولانا عبیداللہ سندھی کے انقلابی افکار کی امانت دار یہی زبان ہے۔

۱۷۰۷ء کے بعد اردو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور تشخص کا نشان بن گئی۔ میر جعفر زٹلی نے اورنگ زیب کے مرثیہ میں برعظیم میں مسلم اقتدار کے خاتمہ کا مرثیہ لکھا ہے۔ اردو کے مسلمان شاعروں کو اپنی جداگانہ قومی شخصیت کا احساس برابر رہا۔ عہد محمد شاہی میں ہندو مسلم فساد اور مسلم جوتا ساز کی شہادت پر بے نوا کے مرثیہ سے لے کر مصحفی کے اس شعر تک ہمیں قومی شعور کی ایک نیم بیدار شکل ہر جگہ نظر آتی ہے۔

اسلامیوں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

انیسویں صدی کے آغاز میں تحریکِ سید احمد شہید کی صورت میں قومی شعور بہت واضح شکل میں سامنے آ گیا۔ اس تحریک کی زبان، اردو تھی اور اس تحریک نے جو ادب پیش کیا ہے وہ

نہایت اہم ہے۔ یہ تحریک محض ایک سیاسی تحریک نہیں تھی بلکہ احیائے دین کی ایک اہم تحریک ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی پہلی نمایاں قومی تحریک تھی۔ اس تحریک کے شعراء بالخصوص مومن خان مومن کو عہد غلامی میں اردو بلکہ مسلمانوں کا پہلا قومی شاعر قرار دینا درست ہوگا۔ (۷)

۱۸۶۷ء میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا اظہار سیاسی سطح پر کیا گیا' لیکن اس سطح پر بھی یہ محض سیاسی مسئلہ نہ تھا' بلکہ ایک قوم اپنے علیحدہ تہذیبی وثقافتی وجود کی سیاسی جدوجہد کا آغاز کر رہی تھی۔ اور اس کا سبب ہندی اردو مسئلہ تھا۔ اردو کی مخالفت ہندوؤں نے اس بنیاد پر کی تھی کہ وہ قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے اور اسلامی اقدار کی آئینہ دار ہے۔

معلوم باتوں کے تفصیلی ذکر کی ایسے مقالے میں گنجائش نہیں جسے اربابِ علم کی خدمت میں پیش کرنا مطلوب ہو' لیکن چند اشاروں سے تاریخی ترتیب کو قائم رکھنا مناسب ہوگا۔

اس نازک تاریخی موڑ پر سرسید تحریک برِعظیم کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کی تحریک بن گئی۔ یہ تحریک مذہبی بھی تھی' تعلیمی بھی اور اپنے مضمرات کے اعتبار سے سیاسی اور معاشرتی بھی۔ اس پر کوئی ایک لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ اس تحریک کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے ارکان نے مسلمانوں کے سیاسی' تعلیمی' معاشرتی اور مذہبی مطالبوں' تقاضوں اور پہلوؤں کو ادب کی سطح پر پیش کیا۔ جب مطالبے اور اجتماعی وقومی تقاضے ادب کی تخلیقی سطح پر پیش کئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب وہ قوم کے تخلیقی شعور اور قوت کا حصہ بن گئے ہیں۔ سرسید کی تحریک کو عقلیت پرستی کی تحریک بھی کہا گیا ہے۔ یہ بات مسائل کی نوعیت کے اعتبار سے ایک حد تک درست ہے' لیکن یہ پہلو قابل غور ہے کہ یہ مسائل ہماری قوم کے جذبہ کی اساس بن گئے اور اس نے ان اقدار اور اس نظریہ کو نئے انداز سے اپنا لیا کہ وہ ایک جداگانہ قوم ہے۔ یوں عقلیت پرستی کے ساتھ جذبہ کی ہم آہنگی اور پیوندکاری نے قومی شعور کو اس سطح پر پہنچا دیا کہ اس نے اس ادب کو جنم دیا جو آج کی ادب کی بنیاد ہے۔ قومی شعور اور ادب کا معاملہ دوطرفہ ہے۔ ایک طرف تو قومی شعور ادب کو نئے سانچے میں ڈھالتا ہے اور دوسری طرف ادیبوں کا شعور

ان کے ادب کے وسیلے سے افرادِ قوم کی فکری اور جذباتی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔ادب کی تخلیقی سطح تک پہنچے بغیر کوئی نظریہ یا اقدارِ قوم اور افرادِ قوم کے رگ و ریشہ میں نہیں سما سکتیں۔ آگے چل کر اقبال کے سلسلہ میں یہی بات قدرے تفصیل سے پیش کی جائے گی۔

سرسید احمد خان نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ قومی شعور کو ادب کا حصہ بنا دیا۔اس کاوش میں نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، مولانا حالی اور ان کے دوسرے ہم عصر ان کے شریک تھے۔سرسید نے تہذیب الاخلاق کے آخری شمارے میں اپنے کام کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا۔

''اردو زبان کا علم ادب جو بدخیالات اور موٹے و بھدے الفاظ کا مجمع ہو رہا ہے اس میں جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اصلاح چاہی۔یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا، مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں ان باتوں میں بہ قدر اپنی طاقت' کے کوشش کی۔قومی ہمدردی، قومی عزت' سلف آنر یعنی آپ اپنی عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے علم و ادب میں داخل کیا۔ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا۔قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو زبان کے علم ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے پایا۔ اب بہت لوگ ہیں جو ان باتوں کو پکارتے ہیں، گو اس وقت ٹھہری لہریں کھاتے ہیں مگر پانی میں حرکت ہی آ جانا کافی ہے۔(۸)

قوم کا لفظ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا ہے۔بعض لوگوں نے اس کی تعبیر یہ کی ہے کہ ''اپنی قوم'' سے سرسید کی مراد ہندوستانی قوم ہے۔یہ تاویل و تعبیر لاعلمی پر نہیں بلکہ بدنیتی پر مبنی ہے کیونکہ سرسید نے اپنے ''قومی نظریہ'' کا اظہار بہت واضح طور پر کئی مقامات پر کیا ہے۔مثلاً طیب جی کے نام اپنے خط میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نیشنل کانگریس کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف ذاتیں، فرقے اور مذاہب کے افراد رہتے بستے ہیں ایک قوم کے افراد ہیں یا یہ کہ ایک قوم بن سکتے ہیں اور ان کے اغراض و مقاصد دینی و ملی بھی یکساں اور ایک ہی

ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز بالکل ناممکنات میں سے ہے۔''(۹)

سرسید کے رفیق اور سوانح نگار حالی نے اپنی شاعری کے ذریعہ سرسید تحریک کے جذباتی رنگ کو نئی تخلیقی گہرائی عطا کی۔ حالی کی ایک نہایت اہم نظم ''شکوۂ ہند'' کی تاریخی اہمیت پر ابھی تک پوری طرح غور نہیں کیا گیا ہے۔ یہ پہلی نظم ہے جس میں ''وطنیت'' اور مسلم قومیت کی کشمکش کھل کر سامنے آئی ہے۔ ہمارے قومی شعور کی ادبی تاریخ اور صورت گری میں یہ نظم ایک تاریخی موڑ کا درجہ رکھتی ہے۔ شاعر ہندوستان کی فیاضیوں، حسن اور بخشش و عطا کا معترف ہے لیکن اسے یہ شکوہ ہے کہ یہاں سہل پسندی اور تن آسانی کی چھاؤں نے مسلم قوم کو اپنے تشخص سے محروم کر دیا ہے۔

نیک دل حالی نے اپنے لہجہ کو گرم و سرد زمانہ سمجھ کے معتدل بنالیا تھا لیکن شکوۂ ہند میں لہجہ کی وہ نرمی نہیں ملتی جسے حالی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ حالی نے خاک ہند کو غارت گر اقوام قرار دیا ہے۔ حالی ہندی مسلمانوں کو ہر جوہر کردار سے معرا دیکھتے ہیں اور اس کا سبب زمین سے اس وابستگی کو قرار دیتے ہیں جو نظریہ، اقدار اور اندازِ زیست پر غالب آ گئی۔

چھین لی سب ہم سے یاں شانِ عرب آن عجم
تو نے اے غارت گر اقوام واکالِ الامم
ہم کو ہر جوہر سے یوں بالکل معرا کردیا
تو نے اے آب وہوائے ہند یہ کیا کردیا
آئے تھے اے ہند! یاں ایسے ہی ہم زاد نزار
ہے عرب کو بن سے ننگ اور ہے عجم کو جن سے عار
ہم انہیں اسلاف کے معلوم ہوتے ہیں خلف
جن کی تھی محکوم نسلِ رستم واسفندیار
ہم انہیں باپوں کے بیٹے تجھ کو آتے ہیں نظر
جن کی جولاں گاہ تھی تارتار سے تازنجیار

کردیا شیروں کو تونے گوسفند اے خاکِ ہند
جو شکار افگن تھے آ کر ہوگئے یاں خودشکار

شکوۂ ہند کے ہندوؤں میں بڑی ترتیب اور دردمندی سے یہی بنیادی سوال اٹھائے گئے ہیں۔ یہ خیرالامم کی حجازی غیرت اور ملی حمیت کی شعری وفنی تلاش ہے اور اس تلاش کی جڑیں ہماری تاریخ اور نظریہ کی زمین میں دور تک پیوست ہیں۔

شبلی کے ہاں یہ نیم معتدل نیم سخت لہجہ' للکار اور انقلاب کی آواز میں بدل گیا۔ پُر دل اور گرم دل شبلی ایک طرف اپنی شاعری میں برعظیم کے مسلمانوں کے مسائل ومصائب کو جرات سے پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ اسلامی ممالک کے مسائل اور شدائد کو اپنے دل کی دھڑکن کی طرح محسوس کرتے اور دوسروں کو سناتے ہیں۔ مسجدِ کانپور اور جنگ بلقان دونوں شبلی کے جذبات کو اکساتے اور انہیں نغمہ سرائی' نوحہ گری پر مجبور کرتے ہیں۔

پہنائی جارہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سیدِ سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی تو مجھ کو
شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

(علمائے زندانی)

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے' یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا' اس کا امتحاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

(شہرآشوب اسلام)

شبلی کے طنزیہ لہجے نے اگر جوش کے اسلوب کی شیرازہ بندی میں حصہ لیا ہے تو شبلی کی نظموں میں عالمِ اسلامی کے مسائل سے تعلق کا ایسا اظہار، اقبال کی شاعری کی نوید ہے۔ شبلی کا قومی شعور عالم گیریٔ ملت کا نقیب ہے۔

مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالم گیریٔ ملت
عراق و فارس نجد و حجاز و قیرواں تک ہے

اردو ادب میں قومی شعور کا اظہار یک طرفہ نہیں ہے۔ اردو کے ادیب اور شاعر نے واقعات کی تہوں کو کھرچ کر حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ سرسید تحریک اور اس کے ادب کا مطالعہ اکبر الہ آبادی کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا

''کسی ادب پارے کے معیار اور شدت کا انحصار بڑے حد تک اس بات پر ہے کہ مصنف اپنے ذاتی سچ کو کس طرح دریافت کر سکتا ہے۔ اور کس طرح اسے اپنے عہد کے اجتماعی سچ سے ہم آہنگ کر کے اسے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا سکتا ہے''(۱۰)

اکبر الہ آبادی نے سرسید تحریک کے ادیبوں کی طرح یہ فریضہ انجام دیا۔ انہوں نے سچ کا وہ گوشہ دیکھا جو سرسید کے رفقا کی نظروں سے اپنے تحریکی مفاد کی وجہ سے پوشیدہ رہا تھا اور یوں ہم کو سچائی کے ہیرے کے آٹھویں پہلو کی چمک نصیب ہوئی۔

بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں میں اردو ادب میں قومی شعور کا نہایت گہرا اظہار ہوا ہے۔ یہ اظہار ہمہ گیر اور اتنا شدید ہے کہ اس نے صحافت کو ادب کا معیار عطا کر دیا۔ الہلال اور البلاغ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ سید سلمان ندوی کی تحریریں اس کی ایک مثال ہیں۔

اقبال اردو زبان کی حد تک ادب میں قومی شعور کے اظہار اور نمود کی سب سے مکمل مثال ہیں۔ قرآن حکیم اور احادیث نبوی کے حقائق کو انہوں نے زندگی کی گہرائی بنا کر پیش کیا۔ اور گہرائی بھی ایسی جو محسوس کی جانے والی ایک شے بن گئی ہے۔ رشید صاحب نے اس حقیقت کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہیں لکھا ہے کہ منبر و محراب سے علما کی زبان سے

قال اللہ اور قال الرسول سننے والے اور اس سے اثر نہ لیتے ہوئے جب وہی باتیں اقبال کی زبانی سنتے ہیں تو ان کے وجود کی گہرائیوں کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اقبال لمحہ موجود میں ماضی کا سفر کرتے ہوئے مستقبل کا خواب دیکھنے کی سکت رکھتے تھے۔ ان کی اس قوت کا اظہار پاکستان کے خواب کی صورت میں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے تخلیقی ذہن نے اسلام کی تاریخ اور اصول کا تجزیہ اس طرح کیا کہ مسلم قومیت کے خدوخال واضح ہو گئے۔ مسلم قومیت کی گفتگو اس مقالے میں آگے کی گئی ہے۔ اس جگہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے اردو ادب کے سہارے قومی شعور اور ادب کے رشتے کی چند مثالیں پیش کی ہیں۔ قومی تاریخ ' روایات اور نظام اقدار ' قومی شعور کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہ قومی شعور ادب کے پیکر میں ڈھل کر ذہنوں کو روشنی اور دلوں کو گرمی عطا کرتا ہے۔ دلِ زندہ کی تخلیق ادب کا کرشمہ ہے ' اور قرآن حکیم کے نزدیک تو فکر کا تعلق بھی دل سے ہے۔ غالباً اس طرح کتابِ عظیم نے فکر کے جذباتی پہلو کی اہمیت کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے۔ زندہ اور تخلیقی فکر جو کائنات کو بدل سکے ہمیشہ جذباتی رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔

۔۳۔

ابھی میں نے نظامِ اقدار کی بات چھیڑی ہے۔ کسی قوم یا انسانی جماعت کی قدروں کے درمیان ایسا رشتہ بہر صورت ہوتا ہے کہ اسے نظام قرار دیا جائے۔ ان قدروں میں تاریخ کے عمل اور سماجی کوائف کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ قدریں باقی رہیں لیکن ان کے مظاہر اور سیاق وسباق بدل جائیں۔ قدروں کی اس ''اضافیت'' کے باوصف ایک حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ بہت سے ذہنی ' فکری ' سماجی اور ایسے ہی دوسرے اختلافات کے باوجود مختلف اقوام نے ہمیشہ بعض قدروں کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان قدروں کی تعبیر و تاویل میں قدرے اختلاف ہو۔ سچائی اور صداقت کے لئے سقراط نے زہر کا پیالہ پیا۔ برِعظیم میں مہا بھارت کی جنگ لڑی گئی۔ دشتِ کربلا میں حسینؓ نے اپنے لئے شہادت کا انتخاب کیا۔ انسانی تارخ میں یوں بھی ہوا ہے

کہ بعض قدروں کو کسی مہذب معاشرہ نے بھی قبول کرنے سے وقتی طور پر انکار کردیا لیکن بعد میں وہ قدریں ابھر کر اس معاشرہ کا آئین ودستور بن گئیں۔ عہد قدیم کے یونانی اپنے تمام فلسفہ وعلم کے باوجود انسانی مساوات کے قائل نہ تھے اور غلامی کے ادارہ کو افلاطون اور ارسطو جیسے حکما نے بھی ایک فطری صورت حال جانا۔ امریکہ میں غلامی کو مدتوں قبول عام حاصل رہا۔ آج بھی نسل پرست قومیں موجود ہیں لیکن مساوات انسانی آج کی زندہ قدر ہے۔

میرے نزدیک بعض آفاقی، ازلی اور ابدی اقدار کو تسلیم کرنا، انسانی تاریخ کے تسلسل کی خاطر ناگزیر ہے اور مختلف قوموں اور عہدوں میں ان کا وجود ان کے سرچشمہ مشترک کی طرف ہماری راہبری کرتا ہے۔ یہ سرچشمہ وحی الٰہی ہے۔ قرآن حکیم کی شہادت کے مطابق ہر قوم میں ہادی اور نذیر بھیجے گئے۔ آج کی وہ قومیں جو انسانی ذہن سے ماورا کسی وسیلۂ ہدایت ورشد کو تسلیم نہیں کرتیں ان کا بھی ان اقدار پر یقین یا تو ماضی کے ورثہ کی حیثیت رکھتا ہے یا پھر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان بے شمار گمراہیوں اور تجربوں سے گزر کر آخرالامر انہیں راستوں اور اسی منزل کی طرف آرہا ہے جو اس کا مقدر اور وحی الٰہی کا مقصود ہے۔

لیکن اس عبوری زمانے میں ایک بے مقصدیت خاصی عام ہوگئی ہے جس کی چھاپ آج کے ادب پر بھی نظر آتی ہے۔ اسے کبھی جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے، کبھی اپنی تلاش کا۔ آج کا ادیب ایک طرف تو اس سہ جہتی مکالمے سے محروم ہے جو انسان اور خدا، انسان اور کائنات اور انسان اور انسان کے درمیان ہوتا ہے دوسری طرف وہ وقت کے تسلسل کے احساس سے محروم ہے۔ وہ لمحہ موجود کو حقیقتِ واحدہ سمجھ کر ماضی کی تکفیر اور تحقیر کرتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ جس لمحے وہ ماضی سے انکار کرتا ہے، اسی لمحے وہ لمحہ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔ آج کا ادیب اپنی تنہائی کے زنداں میں اسیر ہے کیونکہ وہ اپنی جماعت سے بیگانہ ہے اور اس بیگانگی کا سبب یہ ہے کہ وہ اس نظامِ اقدار سے انکار کرتا ہے جسے ہم دوسرے لفظوں میں نظریہ کہہ سکتے ہیں۔ یوں ''اقدار'' اور ''نظریہ'' پر بحث دو الگ موضوعات پر مختلف بحثیں نہیں ہیں، بلکہ دو الگ اصطلاحوں کے ذریعہ ایک ہی موضوع پر بحث کے مترادف ہے۔ اگرچہ اصطلاحوں کے فرق

کا اثر اندازِ بحث اور اسلوبِ گفتگو پر مرتب ہوسکتا ہے۔ ''اقدار'' اور ''نظریہ'' کا رشتہ قومی شعور سے بہت واضح ہے، کیونکہ یہ اقدار ہی افراد کو اپنے رشتہ سے منسلک کر کے انہیں ایک قوم بناتی اور قومی شعور عطا کرتی ہیں۔

آج کے ادیب کا مسئلہ یہ ہے کہ آج کی زندگی اس کے لئے بنیادی طور پر بے مقصد ہے اور آج کا انسان شک، ذہنی انتشار اور نفسیاتی خوف میں مبتلا ہے۔ (۱۱)

اس بے مقصدیت اور خوف نے ابلاغ کے راستے میں کتنی ہی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ آج کا ادیب اپنے ذاتی استعارے استعمال کرتا ہے لیکن اس کی معنویت کو اپنی تحریر کے سیاق و سباق میں ابھارنے میں ناکام رہتا ہے۔ پھر معاملہ محض زبان کا نہیں ہے۔ آج لکھنے والے اور قاری کے درمیان اقدار کا پل ٹوٹ گیا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرتا چلوں کہ میں روایتی اخلاق اور ان اقدار کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو زندہ حال کا زندہ حصہ بننے کی صلاحیت نہ رکھتی ہوں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے زندگی بخش اقدار سے منہ موڑ لیا ہے۔ اقدار سے محبت، ہم میں کسی مقصد اور نظریہ سے والہانہ اور جذباتی و فکری وابستگی (Commitment) پیدا کرتی ہے۔ یہ وابستگی قلب و نظر کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے اور فن کار پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ

بولے نہیں وہ حرف جو ایمان میں نہ تھے
لکھی نہیں وہ بات جو اپنی نہیں تھی بات

میں نے قلب و نظر کی گہرائیوں کی بات Commitment کے سلسلے میں کہی ہے اور فن کار کی فکری آزادی اور انفرادیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ بات میں نے اسلام کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہی ہے۔ اسلام جو ہمارا نظریہ ہے اور جو ہمیں جماعت کا حلقہ بگوش بنانے کے ساتھ ساتھ فرد کی حیثیت سے ہماری اہمیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ اسے محکم تر کرتا ہے۔ قرآن حکیم تو مسلمانوں کے بارے میں یہاں تک ارشاد فرماتا ہے کہ یہ لوگ آیاتِ الٰہی پر بھی اندھے بہرے بن کر نہیں گرتے۔ اسلام ہمیں حدود اللہ میں رہ کر آزادیٔ فکر عطا کرتا ہے بلکہ تفکر کا حکم دیتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام قومی شعور کا سرچشمہ بھی نہیں بلکہ ادیب کی آزادی کی

ضمانت بھی ہے۔ یوں ادیب Commitment کے باوجود جابرانہ اور آمرانہ تجدید (Regimentation) سے آزاد رہتا ہے۔

جماعت اور قوم سے وابستگی ادب کی تخلیق کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادیب کی انفرادیت کا تحفظ بھی لازم ہے۔ Bradbury کے خیال کے مطابق ادب کسی معاشرہ میں بڑے پیچیدہ اور ہمہ جہتی انداز سے وجود میں آتا ہے۔ معاشرہ کو وضاحت عطا کرتا ہے اور ادیب خود بھی معاشرہ کی وضاحتوں کو قبول کرتا ہے۔ اگر ادب گہرا سماجی وجود رکھتا ہے تو یہ گہرائی اتنی ہی پیچیدہ ہوگی جس قدر وہ ادب اچھا ہوگا۔ اچھا ادب بیک وقت زیادہ انفرادی اور زیادہ آفاقی ہوگا۔ وہ انسانی تجربہ میں زیادہ گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ (۱۲) بریڈی بری نے ادب اور سماج کے تعلق کو عمرانیات کے پس منظر اور رشتہ کے تحت پیش کرتے ہوئے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ ''ادبی تخیل میں سماج میں سرایت کر جانے (اور اس سے نبرد آزما ہونے) کی غیر معمولی قوت ہوتی ہے۔ یوں ادب سماج کی بہترین اقدار کا اظہار کرتا ہے۔ ادب شعور کے تاریخی ارتقا میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ تاریخ یا حقیقت کی عکاسی بھی کرتا ہے اور ان کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ ادب کو اساسی طور پر ذہنی تخلیق' کاوش اور سرگرمی قرار دیا جاسکتا ہے' لیکن ایسی کاوش جو سماجی طور پر وجود میں آتی ہے کیونکہ ادیب ذہنی تاریخ کے دھارے کا حصہ ہے اور ان اقدار کا اظہار کرتا ہے جو کسی سماج' قوم اور عہد کے سیاق وسباق کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔'' (۱۳)

ادب قومی شعور کی تخلیق و تعمیر میں کئی پہلوؤں اور طریقوں سے حصہ لیتا ہے۔ تبلیغ و تعلیم' بہتر زندگی کے شخصی اور اجتماعی تصورات' خواب اور فرار' ہم خواب اور فرار سے بھی قطعِ نظر نہیں کرسکتے۔ میں انتہائی مثال کے طور پر اردو کے جاسوسی ادب کی مثال دوں گا جس کے واحد نمائندے ابن صفی ہیں۔ ان کے جاسوسی ناولوں میں بھی ہماری اقدار اور سماجی اوامر ونواہی کی عکاسی ملتی ہے۔ اس مطالعے میں ان تحریروں کا ذکر کیا جاچکا ہے جن کے لکھنے والے اپنی ذات کے زنداں میں اسیر اور ابلاغ کے کرب میں مبتلا ہیں۔ وہ اپنے کرب کی نوعیت کو پوری طرح

نہیں سمجھتے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ادب ایسے کوائف وحالات کے بطن سے جنم لے سکتا ہے جن کو خود لکھنے والا پوری طرح نہ سمجھ سکے۔ یہ بھی شعور کی ایک شکل ہے۔

مقالے کے اس حصے میں ادب اور قومی شعور کے تعلق کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ بعض ٹکڑوں میں شاید آپ کو زیادہ ربط نظر نہ آئے۔ یہ ایک شعوری کوشش ہے کیونکہ مقصد مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو گرفت میں لانا اور آپ کو اس سفر میں اپنا شریک بنانا ہے۔ ان پہلوؤں کو جوڑنے سے شاید کوئی واضح تر صورت سامنے آسکے۔ آخر بچے بھی گتے کے ٹکڑے جوڑ کر تصویر مکمل کر لیتے ہیں پھر ہم ادب وشعور کے معاملے میں ذہنی کاوش کے عمل سے کیسے بھاگ سکتے ہیں۔

مقالے کے تیسرے حصے کے آخر میں میں یہ عرض کروں گا کہ میں خالص شاعری کے تصور کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں اور شاید یہ بھی مان لوں کہ شاعری کا فی نفسہ کوئی فریضہ نہیں لیکن اس بات پر زور دوں گا کہ آپ ٹے ایس الیٹ کی اس بات کو مان لیں کہ

"Poetry may lave a Deliberate, Conscious, Social Purpose"14

آگے چل کر الیٹ نے ایک اہم بات یہ کہی کہ ''ہر قوم کی اپنی شاعری ہونی چاہئے اور یہ بہت اہم چیز ہے۔'' (۱۵) الیٹ نے کچھ شاعری کے بارے میں کہا ہے وہ دراصل مجموعی طور پر ادب کے بارے میں ہے۔ ادب ہر قوم کو اس کے ذہنی اور قومی پس منظر کے مطابق قدریں عطا کرتا ہے۔ یہ قدریں معاشرے اور مذہب وفلسفہ میں تو موجود ہوتی ہیں لیکن انہیں جذباتی اساس ومزاج ادب عطا کرتا۔ نظریئے اور قدریں محض عقلی نہیں ہوتیں بلکہ جذباتی بھی ہوتی ہیں اسی لئے ایک بلند تر سطح پر اور گہرائی میں ان کا ظہار ادب میں ہوتا ہے۔ ادب کسی قوم کی جذباتی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے اور اس کے شعور کا نقطۂ ارتکاز واظہار بن جاتا ہے۔

ادب کا ذریعۂ اظہار چونکہ زبان ہوتی ہے اسی لئے قومی شعور سے زبان کا رشتہ بھی نہایت سامنے کی بات ہے۔ الیٹ کے الفاظ میں ''ایک قوم سے اس کی زبان چھینی جاسکتی ہے اور کوئی

دوسری زبان اس کے اسکولوں پر ٹھونسی جا سکتی ہے لیکن جب تک اس قوم کو آپ نئی زبان میں محسوس کرنا نہ سکھائیں، آپ پرانی زبان کو مٹا نہیں سکتے۔ وہ زبان اس کی شاعری میں دوبارہ ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ شاعری، جو جذبات کا وسیلۂ اظہار ہے۔'' (۱۶)

۔(۴)۔

گزشتہ چند برسوں میں بعض خاص حلقوں کی کوشش سے یہ رجحان ہمارے ہاں پیدا ہوا ہے کہ ہم ''مُسلمات'' پر بحثیں کرتے ہیں اور انہیں بھی نزاعی معاملات میں بدل دیتے ہیں۔ مثلاً قومی کلچر پر ہمارے ہاں جس طرح بحث کی گئی یا اب قومیت پر جس انداز سے گفتگو کی جا رہی ہے یا نظریہ یا (آئیڈیالوجی) پر جس انداز کی سیاسی موشگافیاں کی جا رہی ہیں۔ یہ سارا سلسلہ ہماری قومی شخصیت کو مشکوک بنانے کی ایک سعیِ مسلسل ہے۔

ہر عہد میں اس کی اصطلاحوں میں گفتگو کرنے کے فیشن سے ہم سب واقف ہیں۔ اس کے بعض خطرناک نتائج بھی سامنے آتے ہیں۔ مثلاً اسلام کی جگہ ''اسلامی نظریہ'' کہنا اور لکھنا۔ نظریۂ پاکستان کی اصطلاح بھی بظاہر ایک غیر ضروری اصطلاح معلوم ہوتی ہے اور ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدھے سادے انداز میں ''اسلام'' کیوں نہ کہا جائے کیونکہ اسلام ہی پاکستان کی بنیاد ہے۔ اس اصطلاح کا سیاسی پہلو اسے قابل قبول بنا دیتا ہے۔ ''نظریۂ پاکستان'' کی اصطلاح اسلام کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ عہد میں پاکستان کی جغرافیائی حدود کی ضمانت بھی مہیا کرتی ہے۔ اسلام کا مقصود آفاقیت ہے لیکن ابھی دنیا بین الاقوامیت کی منزل سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ پاکستان اس آفاقیت کی نوید بھی ہے اور اس کی ایک اکائی بھی ہے۔ ایسی کئی اور اکائیاں انشاءاللہ وجود میں آئیں گی جو اسلام کو اپنی اساس قرار دیں گی اور یہ وحدتیں اس کُل کو جنم دیں گی جو وحدتِ آدم سے عبارت ہوگا۔

آئیڈیولوجی کی اصطلاح کو ہمیں اس کے گہرے مفاہم کے ساتھ سمجھنا ہوگا۔ Daniel Bell نے آئیڈیولوجی کی تعریف یوں کی ہے کہ ''عملی مقاصد کے لئے تصورات کا استعمال ہی آئیڈیولوجی ہے۔ تصورات کا سماجی سطح پر صورت پذیر ہونا ہی آئیڈیولوجی ہے۔'' ہمارا عہد

نظریات کی ترقی اور تصادم کا دور ہے۔ ایک سے زیادہ ریاستیں یا قومیں ایک آئیڈیولوجی یا نظریہ کی علم بردار ہو سکتی ہیں۔ مثلاً امریکہ، برطانیہ اور مشرق و مغرب کے کتنے ہی ممالک جمہوریت کی آئیڈیولوجی کو اپنی بقا کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور اس کے باوجود ان کی خود مختاری قائم رہتی ہے۔ اسی طرح اسلام کو اپنا نظریہ قرار دینے والے ملکوں اور سیاسی قوموں کے لئے اپنی انفرادیت کو ختم کرنا لازم نہیں، ہاں یہ انفرادیت اسلامی وحدت کے تابع ہوگی۔

نظریات کی ترقی، اپنے ''مفادات'' کے بارے میں لوگوں کے احساس و شعور کی ترقی ہے۔ ottoHintze نے آئیڈیولوجی کی اہمیت کے بارے میں نہایت اہم بیان پیش کیا ہے۔

''جب کبھی مفادات کو سرگرمی کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ایک آئیڈیولوجی ابھر کر سامنے آتی ہے جو ان مفادات کے لئے معانی، نئی قوت اور جواز مہیا کرتی ہے اور یہ آئیڈیولوجی اتنی ہی حقیقی ہوتی ہے جتنے وہ مفادات، کیونکہ آئیڈیولوجی زندگی اور اس کے طریقِ کار (Process) کا ناگزیر حصہ ہے جو عمل کی صورت میں منقلب ہو جاتا ہے۔ تصورات دنیا کو اسی وقت بدل سکتے ہیں جب وہ حقیقی مفادات کی سطح پر پہنچ جائیں۔'' (۱۷)

تخلیقی سطح پر آئیڈیولوجی کے بارے میں سچی حقیقت پسندی کے ابھارنے اور پیش کرنے میں دانش ور طبقے، بالخصوص ہمارے ادیبوں کو اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ ان دنوں ''نظریۂ پاکستان''، ''مسلم قومیت'' اور آئیڈیولوجی کے مسائل کو ہمارے سیاست داں اپنے مفادات کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں حقائق کو مسخ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے حاشیہ بردار دانش ور بھی شریک ہیں۔

اس مطالعے کے آغاز میں مسلم قومیت اور پاکستان کے قیام کے سلسلہ میں مسلم قومیت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ کہنا تاریخی غلط بیانی ہے کہ قائداعظم نے مسلم قوم کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ قائداعظم کی ایک تحریر مسلم قومیت کا نہایت فصیح و بلیغ اظہار ہے۔ انہوں نے لکھا۔ ''ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایک قوم ہیں۔ بین الاقوامی قانون کی ہر دفعہ اور شق کے مطابق ہم ایک قوم

ہیں۔ ہم ایک قوم ہیں اپنے ناموں اور نظامِ اسما کی بنا پر، تاریخ اور روایات کی بنا پر، رجحانات اور نظریہ کی بنا پر، اندازِ نظر اور فلسفہ حیات کی بنا پر۔'' قائداعظم کو ایک جداگانہ مسلم ریاست کے قیام کی جدوجہد کے لئے اقبال نے اپنے خطوط کے ذریعے آمادہ کیا تھا اور اقبال نے ۱۹۳۰ء میں واضح طور پر یہ بات کہی تھی کہ یہ ریاست ایک تہذیبی اور ثقافتی اکائی ہوگی کیونکہ اسلام پر انفرادی طور پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی صورت حال کے پیش نظر مجھے اپنے مقالے کے آخری حصے میں اس بحث کو اجمالاً شامل کرنا پڑا ہے کیونکہ قومی شعور کے ارتقا کے لئے قوم کا وجود پیشگی شرط کا درجہ رکھتا ہے۔ تاریخی حقیقت تو یہ ہے کہ ایک قوم نے اپنی ثقافت، تاریخ روایات اور نظریہ حیات کو اپنی اجتماعی زندگی میں جاری وساری کرنے کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔ قومی تشخص کا یہ احساس یا شعور بہت دور تک ہماری قومی تاریخ میں موجود ہے جس کا اظہار ادب کی تخلیقی سطح پر بھی ہوا ہے اور مقالے کے دوسرے حصہ میں اس کی جھلکیاں اختصار کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

آج اسی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے قومیت کی اصطلاح سے کام لیا جا رہا ہے۔ قومیت کی یہ اصطلاح دو بڑے ملکوں میں وہاں کے مختلف علاقوں کے رہنے والوں کے لئے مستعمل ہے۔ دوسرے تمام ملکوں میں اس کی جگہ صوبوں یا ریاستوں (States) یا خطوں کے الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔ قومیت کی اصطلاح ہمارے ہاں علیحدگی پسندی کے لئے نقاب بن گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ روس اور چین میں قومیتوں کو کس حد تک آزادی حاصل ہے؟ کیا کوئی قومیت اپنی مرضی سے ان میں سے کسی ملک سے الگ ہو سکتی ہے؟ اور کیا آئینِ پاکستان میں پاکستان کے مختلف صوبوں کو مناسب حد تک داخلی خودمختاری نہیں دی گئی ہے۔

ہمارے ادیبوں کو قومی شعور کے اظہار کے لئے اس مسئلہ پر اپنے ذہنوں کو صاف کرنا ہوگا اور اسی طرح اپنے فریضہ کو انجام دینا ہوگا جس طرح سرسید، حالی، شبلی اور اقبال نے انجام دیا تھا۔ یہ کوئی ہدایت نامہ نہیں بلکہ ایک آرزو ہے، ایک تمنا ہے کہ ہمارے ادیب اپنے عظیم

منصب پر فائز ہوسکیں۔ یہ کوئی پارٹی لائن کی بات یا جماعتی حکم نہیں ہے۔

پاکستان میں چار قومیتوں کی جو بات اب مسلسل کہی جارہی ہے اس کے سلسلہ میں دو نکتوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ کیا قومیتیں واضح طور پر ایسے علاقوں میں آباد ہیں کہ خطہ اور علاقہ کی بنیاد پر جغرافیائی تقسیم ممکن ہوسکے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کیا آبادی کا ایک مستقل نمونہ (Pattern) قائم ہوگیا ہے یا ابھی سیال صورت میں ہے۔ (۱۸)

صوبہ سرحد کی آبادی اب کم وبیش سوا کروڑ ہے لیکن اس کے سب سے زیادہ آبادی والے ضلع ہزارہ میں غیر پختون آباد ہیں جن میں بیشتر گوجر اور ہندکو بولنے والے مخلوط النسل پٹھان ہیں۔ چترال، گلگت، ہنزہ کے لوگ بھی پختون نہیں۔ پشاور کی آبادی کی اکثریت، مختلف ایرانی اور مرکزی ایشیائی قبیلوں اور نسلوں کے فرزندوں پر مشتمل ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی آدھی آبادی غیر پختون ہے۔ یہ نصف آبادی بلوچوں، راجپوتوں اور اعوان اقبیلوں اور برادریوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے ایسے علاقے میں نسلی یا لسانی بنیادوں پر پختونستان قائم نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح بلوچستان کے دس اضلاع میں سے تین اضلاع میں پٹھانوں کی اکثریت ہے۔ بالخصوص کوئٹہ، پشین، اور لورالائی میں۔ دو ضلعوں میں راجپوت اور جاٹ بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اسی طرح سبّی، قلات اور مکران میں بروہی، بلوچوں کی بڑی تعداد کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ بلوچستان کی آدھی آبادی بلوچی نہیں ہے۔

سندھ کی کم وبیش ۴۵ فیصد آبادی مہاجروں، پٹھانوں اور پنجابیوں پر مشتمل ہے جن کی زبان سندھی نہیں، اور جو قومیت کے محدود علم برداروں کے مطابق سندھی کلچر سے تعلق نہیں رکھتے۔ صوبہ سندھ کے سب سے بڑے شہر کراچی میں غیر سندھیوں کی اکثریت ہے اور جہاں تک صوبہ کے لسانی پہلو کا سوال ہے۔ یہاں تقریباً آدھی آبادی کی زبان اردو ہے۔ کراچی، حیدرآباد، سکھر کے بیشتر مہاجر، پنجابی اور پٹھان اردو کو اب رابطے کی زبان کے طور پر نہیں بلکہ اپنی پہلی زبان کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

اسی طرح پنجاب کے ایک وسیع علاقے والے پنجاب کے کلچر سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں سرائیکی کے بولنے والے اپنی زبان کو پنجابی کی ایک بولی نہیں بلکہ الگ زبان قرار دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہاں آبادی کا انداز اور نمونہ (pattern) برابر بدل رہا ہے۔ صرف سندھ کے نہیں بلکہ پاکستان کے تمام صوبوں کے لوگ کراچی میں روزی کی تلاش کے لئے آتے ہیں۔ کراچی کو اپنا وطن اور اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔ حال ہی میں جاپان کے علمائے معاشیات وعمرانیات نے کراچی کا ایک معاشی اور لسانی جائزہ مرتب کیا ہے۔ اس جائزے سے جو لسانی صورت حال سامنے آئی ہے وہ اردو کی فوقیت اور ضرورت کو پوری طرح ثابت کردیتی ہے۔

ایک حلقہ قوم اور ملت کے درمیان تعریف کو اپنے نقطۂ نظر کی بنیاد بنانے کے درپے ہے۔ حقیقت یہ ہے قوم اور ملت کی اصطلاحیں سیاسی سطح اور مفہوم کے اعتبار سے ہمارے ہاں مدت سے ہم معانی ہیں۔ علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کی بحث، خط وکتابت اور اس سلسلہ میں سلسلۂ مضامین سے یہ بات واضح ہوچکی ہے۔ ان اصطلاحوں کو ہماری زبان میں مترادف اصطلاحوں کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا اور کیا جارہا ہے اور اس طرح کہ ان کا دینی یا فقہی فرق، علمی بات اور موشگافی بن کر رہ جاتا ہے۔ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

اسلام نے عقیدہ یا آئیڈیولوجی کو قومیت کی بنیاد بنایا ہے۔ اسی بنا پر حضرت نوح کے بیٹے کو ان کی قوم سے خارج کردیا گیا۔ یومِ فرقان میں میدانِ بدر میں اسلام اور کفر کی بنیاد پر اسی دو قومی نظریہ کی توثیق کی گئی۔

قوم کے مسئلہ پر مغرب کی فلسفیانہ ''فکر'' بھی اسلامی نقطۂ نظر کی تائید ہی کرتی ہے۔ اس کو رد نہیں کرسکتی۔ قوم کا سفر ارتقائی ہے، دائرہ کی صورت میں نہیں۔ نٹشے اور ہیگل کے نظریۂ تضاد

بھی اپنے دام میں مستقبل کے امکانات رکھتے ہیں۔ایک تصور (idea) کے بطن سے دوسرا تصور پیدا ہوتا اور پہلا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ مارکس نے اس نظریہ کو تصورات سے آگے بڑھا کر سماجی نظاموں سے وابستہ کر دیا۔قرآن اس کائنات کے ارتقا کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔اسلام کا خدا کائنات میں مسلسل اضافے کرتا رہتا ہے اور یوں نئے نئے امکانات بروئے کار آتے رہتے ہیں۔

یزید فی الخلق مایشا

اِس مقالے میں قومیت کے فلسفیانہ مباحث کی گنجائش نہیں لیکن یہ اشارے مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں۔

ایک اور بات۔آج تنگ نظر وطنیت کو قومیت کا نام دیا جا رہا ہے۔تنگ نظر کی صفت میں نے یوں استعمال کی کہ ہر جغرافیائی ٹکڑے کو ''کُل'' سمجھ کر وحدتِ قومی کی نفی کی جا رہی ہے۔وہ وحدت جو اسلامی ریاست کا پہلا قدم ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جغرافیائی بنیاد پر نہیں بلکہ ہجرت کی بنیاد پر اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ یثرب ہجرت کے عمل سے مدینۃ النبی بن گیا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ نظریہ زمین میں جڑ پکڑتا ہے تو اس کی ایک جغرافیائی صورت ضرور ابھرتی ہے لیکن یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ یہاں جغرافیہ نظریہ کے تابع ہے۔اسلام ایک آفاقی مذہب ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافت بھی ہے جس کے مظاہر، تاریخی ادوار اور جغرافیہ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور مختلف خطوں کے لوگوں کی تخلیقی قوت کو نئے سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں۔آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم میں سے بعض نے تاریخ اور اندازِ فکر کی جگہ محض جغرافیہ سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے اور ہم یہ بھول گئے کہ ہماری تاریخ اور ہمارے طرز حیات و نظریہ نے جغرافیہ کو بدل دیا ہے۔

اسلام وحدتِ آدم کا نقیب ہے۔اسلام کے مطابق زبان، رنگ اور نسل کے اختلاف سے قومیں نہیں بنتیں۔قومیں نظریہ کی وحدت کی بنا پر وجود میں آتی ہیں۔ ہاں جب اسلامی نظریہ کے لئے کوئی خطۂ ارض حاصل ہو جائے تو اس کی نظریاتی سرحدوں کی طرح اس کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت بھی فرض ہے۔

ادیب کے لئے یہ دونوں سرحدیں الگ چیزیں نہیں۔۱۹۶۵ء کی بھارت پاکستان جنگ کے موقع پر جو ادب بالخصوص شاعری وجود میں آئی وہ اسی حقیقت کا اظہار ہے۔اس ادب میں پاکستان ایک نظریہ بھی ہے اور ایک جغرافیائی وحدت بھی۔

آج ہم شدید تر صورتِ حالات سے دوچار ہیں۔ذہنوں میں اندیشے تذبذب' بے یقینی کی فصل بو کر ہمارے قومی وجود کی نفی کی کوشش کی جارہی ہے۔اس جنگ کو ہمارے ادیبوں اور اہل قلم کو اپنی جنگ بنانا ہوگا۔آج بنیادی سوال یہ ہے کہ''ما کیستم ؟''ہمیشہ سے افراد کی زندگی کا بنیادی سوال یہ رہا ہے کہ''من کیستم ؟''میں کون ہوں؟''اسی سوال کے جواب نے فلسفہ اور اعلیٰ ادب کو جنم دیا ہے۔''ما کیستم ؟'' کے جواب سے وہ ادب وابستہ ہے جو ایک قوم کے وجود کا اعلان ہو۔اس سوال کا تعلق آج کے معاشرہ سے اس کی تاریخ کے رشتہ سے ہے۔فرد' معاشرہ اور تاریخ کا تعامل (Interaction) یہی مسئلہ تشخص زندہ رہنے والے ادب کا سب سے اہم موضوع ہے۔اسی سوال سے پہلوتہی بے مقصد بلکہ بے معنی ادب اور فلسفوں کو جنم دیتی ہے۔ولیم بیرٹ (William Barrett) نے امریکی افسانوی ادب میں امریکی اقدار کے مسئلہ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اقدار سے محروم ہو کر ایسا ادب وجود میں آتا ہے جو بظاہر سنجیدہ محروم ہوتا ہے اور ہمیں اپنی سنجیدگی کا یقین دلانا چاہتا ہے حالانکہ وہ سنجیدگی کے حقیقی عناصر سے معلوم ہوتا ہے۔اس صورت حال کا سبب یہ ہے کہ اس عہد میں خود امریکی زندگی ان جذباتی اور نامیاتی گہرائیوں سے دور ہوگئی جن کے بطن سے عظیم ترین ادب ابھرتا رہا ہے۔(۱۹)

تصورات' ادب کی مملکت کا آئین ہیں اور ادیب کا منصب تصورات کو تخلیق کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔Hegel نے Philosophy of Right میں لکھا ہے کہ''تصورات مادی دنیا کو بدلتے ہیں۔مادی چیزیں' ادارے' تہذیبیں' تصورات کا مظہر ہیں۔تاریخ میں تصورات کی ترقی' ریاستوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ریاستیں تصورات کا مادی اظہار اور صورت گری ہیں۔ریاست دنیا میں خدا کی پیش قدمی ہے۔(۲۰) آج پاکستان میں ان تصورات کو نزاعی معاملہ بنایا جارہا ہے جو ہماری ریاست کی اساس ہیں۔پاکستان کا قیام حقیقی معانی میں بیسویں صدی میں خدا کی پیش قدمی ہے' اور اب خلیفہ الٰہی کی حیثیت سے اس پیش

قدمی کو جاری رکھنا ہمارا بالخصوص ہمارے ادیبوں کا فریضہ ہے کیونکہ تصورات کی مملکت ان کی مملکت ہے۔

حوالے

1۔ Theory of lileralure

Chepter Two

2۔ حوالۂ بالا

Chepter Two

3۔ کتاب الہند البیرونی (Alberuni's indea) تلخیص و ترتیب پروفیسر دانی (انگریزی) صفحہ ۲، اسلام آباد یونیورسٹی ۱۹۷۳ء۔

4۔ حوالہ بالا۔ صفحہ ۱۶۹

5۔ اسپیچز اینڈ رائٹنگ آف مسٹر جناح حصہ دوم (مرتبہ جمیل الدین احمد) شیخ محمد اشرف لاہور (یہ ۱۹۴۲ء کی ایک تقریر کا اقتباس ہے)

6۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ راقم الحروف کی کتاب ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ۔۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک'' مطبوعہ ادبی پبلشرز کراچی ۔۱۹۷۵ء (بالخصوص کتاب کا آخری باب)

7۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کا باب ''اردو شاعری اور تحریک سید احمد شہید''

8۔ مقالاتِ سرسید حصہ دہم (سرسید احمد خان) مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، صفحہ ۶۱، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء

9۔ پاکستان منزل بہ منزل صفحہ ۶۹، بحوالہ ہندی اردو تنازع (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۷۷ء

10۔ The Search.for values- Aldridge, John(included in the Amrican Novel Since World War II,ed by Klein

,Marcus),p39

11۔حوالہ بالا صفحہ ۴۳

"They are finding that modern life is still basically purpose,that the typical condition of modern man is still doubt,confuzion and fear"

Literatur and Sociology by Malcom (Literatur) -12 bury.p84(included in Essays, Studies 1970 collocted by A.R.Humphreys).London, 1970

13۔حوالہ بالا صفحہ ۸۸تا ۹۳

On Poetry and poets, T.S.Eliot ,p.4,The Noonday -14 press new yorle,1969.

15۔حوالہ بالا صفحہ ۷

16۔حوالہ بالا صفحہ ۸

Ouoted by Nigel Harris in Beliefs in Society p.9, -17 Watts London, 1968.

The Historial Raclegrooud of Pakistan... and its -18 people, Ahmed Abdulla-p.200-205- Tanzeem publishers, karachi 1973.

Amican ---and amican values by Willian Barrett -19 (inculded in Amrican Novel Since World war II,p.59.

Political Thought from Plato to the present, M.Judd -20 Harman. p.346,new yorc,1964.

ادب میں جمود کا مسئلہ

عابد رضوی صاحب کا فون آیا۔ ''قلم قبیلہ کی سالانہ تقریبات ہو رہی ہیں۔ کیا آپ آئیں گے اور اگر آئیں گے تو کیا ادب میں جمود کے مسئلے پر اظہارِ خیال کریں گے''

''ادب میں جمود کا مسئلہ؟''

''جی ہاں''

''کیا یہ سوال اب بھی زندہ ہے''

''جی ہاں''

''تو پھر ٹھیک ہے''

فون بند ہو گیا، لیکن میں ماضی میں پہنچ گیا جب یہ مسئلہ چھڑا تھا۔

(بیسویں صدی کے) پانچویں عشرے میں ادب میں جمود کا مسئلہ شاید اہم ترین ادبی موضوع بحث تھا۔ موقر ادبی رسائل کے ہر شمارے میں اس موضوع پر مقالے اور مذاکرے شائع ہوتے، اُس زمانے میں میں ماہنامہ ''مہر نیمروز'' سے وابستہ تھا اور ہم نے بھی اس سلسلہ میں کئی تحریریں شائع کیں۔

رسالے شائع ہو رہے تھے، ادبی انجمنوں کے اجلاس برِ اعظیم جنوبی ایشیاء کے بڑے شہروں میں پابندی کے ساتھ منعقد ہوتے تھے۔ مشاعروں کی دھوم تھی۔

ریڈیو آج سے زیادہ ادب کو اہمیت دیتا تھا۔ آج ریڈیو اور ٹی وی کے لئے ادب ایک بے معنی چیز ہے۔ عیدِ میلاد النبی اور یوم پاکستان کے حوالے سے مشاعرے ہو جاتے ہیں اور بس۔ ٹی وی سے ادبی پروگراموں کے سلسلے بند ہو چکے ہیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سنجیدہ ادبی فضاء موجود تھی۔ اس کے باوجود ادب میں جمود کی بحث کیوں چھڑی تھی؟ اس کا پہلا سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے کشت و خون نے

ادیب کے اندر اپنی بے بسی اور بے وقعتی کے شدید احساس کو جنم دیا۔ اس نے انسانی شرف' کرامت' اور عظمت کے جو خواب دیکھے تھے وہ چکنا چور ہو گئے۔ انسانی شرافت اور امکانات کے جو نغمے گائے تھے جیسے بے معنی الفاظ کا مجموعہ بن گئے۔

اس سلسلہ میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کسی بڑے واقعے سے گزرتے ہوئے بالعموم اس کا ادبی اور فنی اظہار ممکن نہیں ہوتا' اور یہاں تو منظر ہی بہت مختلف تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ برو بحر پر فساد غالب آ گیا۔ ادیب رقص وحشت و بربریت کو پتھرائی ہوئی آنکھوں اور خالی ذہن کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ کرشن چندر اور منٹو نے اس عالم میں بھی لکھا لیکن دوسرے لکھنے والے خاصے عرصے تک فسادات اور بربریت کے موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکے۔

جمود کا دوسرا سبب یہ تھا کہ انجمنِ ترقی پسند مصنفین اپنی پالیسیوں کا شکار ہو گئی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے ادبی اثرات تو ہمارے ادب کے لہو کی گردش میں شامل ہو چکے ہیں اور اب ہماری روایت کا حصہ ہیں' لیکن انجمن نے انتہا پسندی کو اپنایا اور اس کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ گزشتہ دس پندرہ برسوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء کی کوششیں کی گئیں' اس کا جشن طلائی بھی منایا گیا مگر وہ جشن کم اور عرس زیادہ۔ جب انجمن انتشار کا شکار ہوئی تو منٹو اور محمد حسن عسکری جیسے لوگوں کے لئے بھی اس کی صفوں میں جگہ نہ رہی۔ ہندوستان میں بھی منظر نامہ اس سے مختلف نہ تھا تو اسی کو جمود کا نام دیدیا تھا اور پاکستان میں تو ایک صاحب نے اردو ادب کی موت کا اعلان کر دیا' اور اُس وقت جب وہ خود بہت اچھے تنقیدی مضامین لکھ رہے تھے جن میں ہمارے ادبی اور لسانی مسائل کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا۔

اُسی زمانے میں ''جدیدیت'' کی تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ جدیدیت مانگے کی روشنی تھی۔ اس سے پہلے بھی مغرب کی بعض ادبی اور فکری و فنی تحریکوں کی نقالی ہمارے ہاں کی گئی' لیکن ایسے رجحانات کسی ٹوٹے ہوئے ستارے کی روشن لکیر کی طرح لمحاتی زندگی رکھتے ہیں۔

اس تحریک کے ذریعے جو ادب تخلیق ہوا وہ بڑی حد تک لوگوں تک ابلاغ میں ناکام رہا۔ یہ جدیدیت اب دوسرے رجحانات کے ساتھ مل کر معتدل ہو گئی ہے اور ابلاغ کی سطح پر پہلے کی

نسبت کامیاب ہے۔

اس دور میں لکھنے والوں کی ایک خاصی بڑی جماعت نے جمود کے وجود سے انکار کیا تھا۔ ادبی اور فلسفیانہ بنیادوں پر یہ لوگ انسانی تاریخ' اس کے فکری ارتقاء کے ساتھ ساتھ خود زندگی کی ماہیت اور وظیفہ کی بنیاد پر جمود کے منکر تھے۔ بڑا مفکر اس خاک داں سے رخصت ہونے کے بعد بھی مستقبل کی نسلوں کی قیادت کرتا ہے۔ اس گروہ کا بنیادی استدلال یہ تھا کہ جب جمود زندگی کے عناصر میں نہیں تو ادب میں کیسے ہوسکتا ہے۔ ادب زندگی کا مظہر ہی تو ہے۔ اور اس گروہ کی فکری قیادت اقبال کرر ہے تھے۔

دمادم رواں ہے یم زندگی
ہر ایک شے سے پیدا دمِ زندگی
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
فریب نظر ہے سکون وثبات
تڑپتا ہے ہر ذرہٗ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

ان خیالات کی بنیادی صداقت کوتسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ پوری دیانت کے ساتھ یہ بات عرض کی جاسکتی ہے کہ یہ اشعار زندگی اور کائنات کے تسلسل' حرکت اور ارتقاء سے متعلق ہیں' کسی انسانی سرگرمی کے بارے میں نہیں ہیں۔ رہی بات کائنات کی' سو کارِ تخلیق ابھی تمام نہیں ہوا ہے۔ اللہ اپنی تخلیقات میں مسلسل اضافہ فرما رہا ہے۔

''یزید فی الخلق مایشا''

یہ کائنات ابھی تام تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدئے کن فیکوں

لیکن اس صدائے کن فیکوں کو سننے کے لیے اقبال کی سی سماعت درکار ہے۔

کائنات اور زندگی کے سفر میں ماندگی کا کوئی وقفہ نہیں آتا اور نہ انہیں دم لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن کار انسانی میں جمود، تنزل اور کبھی کبھی سفر معکوس بھی نظر آتا ہے۔ بالخصوص ادبیات کی تاریخ میں۔

ادب کے کسی عہد زریں کے بعد ایسا دور ضرور آتا ہے جب ادبی تخلیقات کا وہ معیار برقرار نہیں رہتا۔ حقیقی عظمت کے حامل ادیب اور فنکار ماہ و سال کی بے شمار گردشوں کے بعد وجود میں آتے ہیں، اور جب وہ لمحہ آتا ہے تو

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد

اردو ادب کے حوالے سے عرض کروں گا کہ اٹھارہویں صدی میر کی ہے، انیسویں صدی غالب کی اور بیسویں اقبال کی، لیکن ان کے علاوہ ان صدیوں نے اہم فن کار پیدا کیے ہیں جنہوں نے ہمارے ادب، زندگی اور ثقافت کو تنوع، حسن اور اعلیٰ اقدار عطا کی ہیں۔ بیسویں صدی نے مجموعی طور پر اقبال جیسی دیو قامت شخصیت تو پیدا نہیں کی لیکن جوش، فیض، اور راشد کے بغیر ہم اپنے ادب اور اپنے عہد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اور پھر غزل کی حد تک یہ دور میر و مرزا کے عہد کے بعد تیسرا عہدِ زریں ہے۔ حسرت، اصغر، فانی، جگر، یاس یگانہ اور فراق کے بعد فیض، ناصر کاظمی اور عزیز حامد مدنی وغیرہ کا دور۔ خود اقبال کی غزل، اردو غزل کے اطراف و جوانب میں توسیع کا نام ہے۔ میں نے بات کو شاعری تک محدود رکھا ہے ورنہ بیسویں صدی میں اردو نثر کی فتوحات حیرت انگیز اور متنوع ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہم نے حقیقی یا مفروضہ تنزل کو جمود سے تعبیر کیا ہے۔ جمود کا مادہ ج م دے۔ اس مادہ کے مشتقات میں حسن بھی ہے اور معنویت بھی جس سے جمود کے کئی پہلو ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

الجماد...... سست رفتار اونٹنی وہ جس کا دودھ خشک ہوگیا ہو (بنجر زمین کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے)۔

جماد الکف......بخیل آدمی کو کہتے ہیں

عین جمود......وہ آنکھ جس سے آنسو نہ بہیں

گویا آنسو آنکھ کا ایک مقصد اور وظیفہ ہیں۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

اس پس منظر میں ادب کے حوالے سے جب ادب میں افادیت نہ رہے تو یہ جمود کی حالت میں ہے۔ یہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ ادب کی افادیت ٹیلی فون ڈائریکٹری یا کھانا پکانے کی ترکیبوں کی کتاب کی افادیت سے مختلف چیز ہے۔ ادب ہمیں جو مسرت عطا کرتا ہے وہ بھی افادیت ہے۔ ذہن کو جو حظ عطا کرتا ہے وہ بھی افادیت ہے۔ مختلف حقائق کو پرکھنے کی جو نظر عطا کرتا ہے وہ بھی ادب کی افادیت ہے۔ یادش بخیر ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' پر کیسے مجادلے بلکہ مُباہلے ہوتے تھے۔ اب شاید حقیقت دلوں میں جاگزیں ہوگئی ہے۔ کہ یہ دونوں باتیں اُس حقیقت کو مجموعی طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں جسے ہم ادب کہتے ہیں۔

مجھے مجموعی طور پر آج کے اردو ادب' بالخصوص پاکستان کے اردو ادب میں جمود نظر نہیں آتا میرے علم کی حد تک پاکستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے بارے میں یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ ابھی تک ہم نے ان اثرات کا جائزہ نہیں لیا جو قیام پاکستان سے ہمارے ادب پر مرتب ہوئے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ہمارے اہل قلم ثقافتی موضوعات کی طرف متوجہ ہوئے۔ ثقافت کا مسئلہ دراصل اپنی شناخت کا مسئلہ ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم' محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر جمیل جالبی اس سلسلے میں اولیت رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد کئی اصنافِ ادب نے فروغ حاصل کیا۔ فاصلے ایک آزاد قوم کے افراد کے لیے سمٹ جاتے ہیں۔ دنیا کسی نو آزاد ملک کے اہل قلم کے ذریعہ اس

ملک کو سمجھنا چاہتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد ہمارے اہل قلم کو مختلف ملکوں کی سیاحت اور مطالعہ کے مواقع ملے۔ آزادی سے پہلے آغا محمد اشرف مرحوم اور خواجہ احمد عباس نے دلچسپ سفرنامے لکھے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستانی ادیبوں نے سفرنامے کو اردو ادب کی اہم صنف بنا دیا۔ اس سلسلہ میں محمود نظامی، جمیل الدین عالی، ابن انشاء اور اختر ریاض الدین کے نام سب سے پہلے ذہن میں آتے ہیں۔ ان کے بعد کئی اہم ادیبوں نے سفرنامے لکھے۔ ان دنوں حکیم محمد سعید (مرحوم)، مستنصر حسین تارڑ اور قمر علی عباسی وغیرہ مسلسل اس صنف میں اضافہ کر رہے ہیں۔ کئی حضرات وخواتین نے بہت اچھے سفرنامے لکھے ہیں جن کا ذکر اس وقت ممکن نہیں۔

انشائیہ میرے نزدیک نئی صنفِ ادب نہیں جیسا کہ بعض صاحبان کا دعویٰ ہے۔ سرسید، محسن الملک کی چند تحریریں انشائیہ کے دائرے میں آتی ہیں۔ عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی، فلک پیما، پطرس، رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری، خلیق دہلوی، مہدی الافادی کے نام لکھتے لکھتے ذہن میں آ گئے۔ یہ لوگ ہر اعتبار سے انشائیہ نگار تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انشائیہ کے بارے میں تنقیدی فکر کا آغاز ہوا۔ انشائیہ کے خدوخال کو متعین کرنے کے لیے فکری کاوش سے کام لیا گیا اور کئی اچھے لکھنے والوں نے انشائیہ کو اپنی شناخت کا ذریعہ بلکہ مسئلہ بنا لیا اور یوں کہ کبھی کبھی کاغذ کے صفحات پر میدان جنگ کا گمان ہونے لگا۔

قیام پاکستان کے بعد جہاں ثقافت پر گفتگو شروع ہوئی وہاں کئی لکھنے والوں نے اپنی ذات اور اپنے تجربات کی طرف توجہ کی۔ وہ تجربات جو انفرادی بھی تھے اور اجتماعی بھی۔ خود پاکستان کے خواب سے حقیقت بننے کا تجربہ۔ اس سے خودنوشت کا سلسلہ شروع ہوا۔ غالباً اس سلسلہ کی پہلی اہم کتاب احسان دانش کی جہان دانش تھی۔ پھر یادوں کی بارات اور شہاب نامہ وغیرہ۔ ویسے ہمارے دوست کا کہنا ہے کہ سب سے اچھا فکشن خودنوشت کے پیرائے میں لکھا گیا ہے۔

میں نے آج شام بات کو نثر تک محدود رکھا۔ افسانہ کا ذکر میں نے دانستہ نہیں کیا۔ کیوں؟

اس کا جواب دینے کے لیے بھی خاصا وقت درکار ہوگا۔ شاعری کے بارے میں اظہار وقت کی کمی کے باعث ممکن نہیں، لیکن یہ عرض کردوں کہ فیض، راشد، مجید امجد، جعفر طاہر، مختار صدیقی، عزیز حامد مدنی، ابن انشاء، صوفی تبسم، ناصر کاظمی وغیرہ کے بعد ہماری شاعری میں جمود نہ سہی لیکن اب ایک ٹھہراؤ ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ بعض صاحبان کے نزدیک جمود اور ٹھہراؤ مترادف الفاظ ہوں، مگر میری ناچیز رائے میں ان دونوں کے درمیان درجوں کا ایسا فرق ہے جو دونوں کے مفہوم کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتا ہے۔

ادب میں جمود کا ایک ہی واضح ثبوت ہے اور وہ ہے باقاعدہ پابندی کے ساتھ شائع ہونے والے ماہناموں کا فقدان۔ ہمارے موقر رسالے بھی کتابی سلسلے کہے جاسکتے ہیں۔ جب ادبی دنیا، زمانہ ساقی، نگار، ادب لطیف جیسے رسالے پابندی سے شائع ہوتے تھے تو ادیب اور قاری کا رشتہ قائم تھا۔ قاری بڑے لکھنے والوں سے بہت معیاری تحریروں کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان رسالوں سے ادبی فضا قائم تھی۔ کئی ادبی تحریکیں انہیں رسالوں کے صفحات کے سہارے پیدا ہوئیں یا آگے بڑھیں۔ آج قاری ایک متاع گم گشتہ ہے۔ اس کا بنیادی سبب ماہناموں کا فقدان ہے۔

آج اچھا ادب یقیناً تخلیق ہو رہا ہے، لیکن صحت مند ادبی فضا موجود نہیں، ادبی مذاکرے، بین الاقوامی اور قومی ادبی کانفرنسیں، معیاری اور سہ ماہی ششماہی جرائد مل کر بھی یہ ادبی فضا پیدا نہیں کرسکتے جو ادبی ماہناموں نے پیدا کی تھی اور پیدا کرسکتے ہیں۔

ادب کے ارتقاء اور جمود کا مسئلہ ایک اور مسئلے سے پیوست اور مربوط ہے اور وہ ہے تعلیم۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں شرح خواندگی ۳۲ فیصد ہے اگرچہ مجھے اس پر یقیناً شبہ ہے کیونکہ ہمارے ہاں سائنسی جائزوں کا چلن نہیں اور اگر یہ اعداد وشمار درست ہیں تو ہمارے خواندہ افراد کی اکثریت ان پر مشتمل ہے جو صرف دستخط کرسکتے ہیں، کیونکہ وہ Feed back سے محروم ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسین خان مرحوم نے تعلیم بالغاں کے سلسلہ میں کتابوں کی اشاعت شروع کی تھی۔ ان کے بعد اس چراغ میں روشنی نہ رہی۔ اگر کوئی ادارہ یہ کام کر رہا ہے تو مجھے علم

نہیں۔ ویسے بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابیں اس ضرورت کو پوری نہیں کر سکتیں۔ مسئلہ صرف زبان کے سہل ہونے کا نہیں بلکہ بڑوں اور بچوں کی نفسیات اور لکھنے والے کے رویے کا بھی ہے۔

حضرات و خواتین۔

میں قلم قبیلہ کا شکر گزار ہوں کہ مجھے اس اہم تقریب میں شرکت کا موقع فراہم کیا اور آپ حضرات سے ملنے کی مسرت حاصل ہو سکی۔ ادبی ماہناموں کی اہمیت پیش کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں ادبی اجتماعات کے خلاف ہوں۔ ایسے اجتماعات میں اہل قلم اور ادب دوستوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ اور اگر کوئی بات کسی کو ناگوار گزری ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ امیر مینائی کے ایک شعر نے کچھ کہہ گزرنے کی تحریک پیدا کر دی تھی۔

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ دے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

اور آپ حضرات کی موجودگی نے آج شام اس پرانے شعر میں نیا پن پیدا کر دیا ہے۔

شکریہ

۱۹۹۶ء

اسلامی ادیبوں سے چند باتیں

رابطۂ ادبِ اسلامی کی شاخ ہند' مبارک باد کے قابل ہے کہ نہایت اہم موضوعات پر ہر سال مذاکروں کا اہتمام کر رہا ہے۔ فسخ عزائم معرفتِ رب کے راستوں میں سے ایک ہے۔ میں اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود کسی مذاکرے میں شریک نہ ہو سکا۔ میری تمنا ہے کو میری تحریر مذاکرۂ بھوپال کے شرکا تک پہنچ سکے۔ یہ کوئی مقالہ نہیں' لیکن میں اسلامی ادب کے موضوع پر مسلسل سوچتا رہا ہوں اور اپنی فکر میں آپ کو شامل کرنا چاہتا ہوں۔ عاشق مجازی کی غیرت تو شرکتِ غم سے بھی گریز کرتی ہے لیکن ہم خیال ایک دوسرے سے قوت حاصل کرتے ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ' اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ دعوت وتبلیغ اور رُشد وہدایت کی تحریکوں اور کوششوں نے ہمارے ادب کی نقش گری کی ہے' سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کی تحریک وہ پہلی قومی اور ملی تحریک ہے جس کا لبِ اظہار ہماری زبان اردو بنی۔

راقم الحروف نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷'' میں اس تحریک کے ادب اور بالخصوص شاعری کا خاصا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اسی تحریک نے مومن خان مومن کو اردو کا پہلا قومی شاعر بنا دیا۔ اور مومن کا یہ شعر آج نہ جانے کتنے اہل ایمان کی دعاؤں کا حصہ بن چکا ہے۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

سر سید احمد خان کی تحریک کا معروضی مطالعہ آج بہت مشکل نہیں' سر سید احمد خان کے بعض عقائد اور ان کی اعتذار پسندی کے باوجود ان کی تحریک بھی اسلامی تحریک تھی' محسن الملک' حالی' شبلی' نذیر احمد' خود سر سید کی تحریروں کا بڑا حصہ اس قول کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے علی گڑھ

تحریک نے ہمیں جو کچھ دیا وہ مغرب کو اپنا کعبہ بنانے کا نتیجہ نہیں بلکہ اس جذبے کا ثمر ہے۔

خدا دارم دل بریاں زعشق مصطفیؐ دارم

نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

سرسید کی تحریک ہی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے خیال کو حقیقت میں بدل دیا' کیونکہ اہل نظر اُسی وقت اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ہمارے ماضی سے ہمارا ذہنی' علمی اور فکری رشتہ' علی گڑھ کی مدد سے نہیں جوڑا جا سکتا بلکہ اس کے لئے ایک اور ادارے کی ضرورت ہے' ندوہ نے علماء کو تحریر کی طرف مائل کیا' اور یہ بات علامہ شبلیؒ کے حسنات میں میرے نزدیک سرفہرست ہے۔ ندوہ کے جواز کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس نے علامہ سید سلیمان ندویؒ اور حضرت مولانا ابوالحسن ندوی دامت برکاتہم جیسے ادیب پیدا کئے۔ مولانا علی میاں نے ''کاروان مدینہ'' میں تاریخ کو تخلیقی ادب بنایا اور ''پرانے چراغ'' نے شخصیات نگاری کے سلسلے میں مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کی قائم کردہ روایات کو نئی جہتیں بخشیں۔ ''نقوش اقبال'' اب تک کسی عالم کے قلم سے ادبی تنقید پر پہلی مستند کتاب ہے۔ علی میاں کی تحریروں نے ہمیں بتایا ہے کہ اپنی ذات کے حوالے سے اپنے عہد کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

حضرات گرامی میرا قلم میرے تابع نہیں رہتا' یہ بھی ادیب کی مجبوریوں میں سے ایک مجبوری ہے' ادب آزادی کا تقاضا کرتا ہے' خود لفظ تحریر اس پر شہادت ہے کہ فکر' ادب اور تحریر کی اساس ہے' میں تو ادبی تحریکوں کا ذکر کئے بغیر آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا تھا' بہرحال اب تحریر کے رخ کو بدلا ممکن نہیں۔

ادبی تاریخ کا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ کسی نظام اقدار کے بغیر کوئی ادیب بڑا ادیب نہیں بن سکتا۔ اردو کی ترقی پسند تحریک تو ختم ہوگئی' مگر اس نے ہمارے ادب پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ مجنوں اور احتشام کی تنقید' ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں' ناول نگاروں اور شاعروں کے ذکر کے بغیر ہم اپنی ادبی تاریخ نہیں لکھ سکتے' لیکن اس تحریک کا مطالعہ آپ کو یہ بتائے گا کہ جن لوگوں نے پارٹی کی ہدایت ہی کو سب کچھ سمجھ لیا وہ بڑے لکھنے والے نہیں بن

سکے۔ یہ بات فیض ومجاز کا علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی سے مقابلہ کرنے سے واضح ہو جائے گی۔

علی سردار جعفری نے تو فیض کے فن کی اہمیت کی نفی بھی کی اور وہ زمانہ بھی اُن پر گزرا کہ وہ ادبی اور شاعرانہ زبان کے علامتی پہلو کی معنویت کے بھی منکر تھے۔ یہی بات بہت سے اسلامی یا اسلام پسند ادیبوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ ویسے یہ عرض کردوں کہ اسلام پسند کی ترکیب مجھے مطلقاً پسند نہیں۔

حضرات گرامی سوچنے کی بات ہے کہ ہم نے کوئی دوسرا اقبال تو کہاں، دوسرا حفیظ جالندھری اور ماہر القادری بھی پیدا نہیں کیا۔ میرے نزدیک اسکا جواب یہ ہے کہ اسلام ہمارے ذہن کا مرکز ومحور تو رہا مگر ہمارے قلب کی دھڑکن نہ بن سکا۔ ادب مکمل طور پر ہمارا خارج اور باطن ہے۔ پاکستان کے جواں مرگ شاہر اطہر نفیس کا یہ شعر مجھے بہت پسند ہے۔ اس پر غور کیجیے تو تخلیقی فن کے مسئلے کی گرہیں کھلتی جائیں گی۔

خود اپنے ہی باطن سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ۔ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر

شاید آج اسلام کے دامن سے وابستہ ادیبوں کا باطن ایسے موسم سے محروم ہے۔ ایسا موسم جو سارے رنگ اپنے دامن میں رکھتا ہو۔ اسلامی ادیب بعض تضادات کا شکار ہے اور بعض نکتے اس پر آشکار نہیں ہوئے ہیں، مثلاً جنس اور محبت کی اسلامی ادب میں کہاں گنجائش ہے؟ یہ موقع نہیں کہ اس مسئلے کو پوری تفصیل سے یہاں چھیڑوں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اسلام نے انسان کے کسی جذبے کو کچلا نہیں، اسے ایک رخ عطا کر دیا ہے یعنی چینلائزشن کر دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تھوڑی سی روشنی کی ضرورت تھی زیست کو
تھوڑا سا نور ایک ستارے سے مل گیا

غنیمت ہے کہ اس دور ہوس میں
ترا ملنا بہت دشوار بھی ہے

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے
وسعت میں، لطافت میں، محبت میں نمی میں
اقبال کی آواز تیرے دل کی طرح ہے

میرا خیال ہے کہ محبت کی اس سطح اور اس اسلوب کی اسلامی ادب میں پوری گنجائش موجود ہے۔ دونوں قصائد بردہ کی تشبیب کے بارے میں آپ کیا فیصلہ کریں گے؟

اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہوئے اپنی بات یعنی باطن کے موسم کی طرف لوٹتا ہوں۔ باطن کے اس موسم تک رسائی کیسے ہو؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہم بٹی ہوئی شخصیت سے نجات حاصل کر کے ایک سالم شخصیت اپنے اللہ سے طلب کریں۔ ایسی شخصیت جو حصوں میں نہ بانٹی جا سکے۔ یہ شخصیت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ ہمارے رسولؐ کے ذریعہ جو نسخہ ہمارے رب نے ہمیں عطا کر دیا ہے۔ یاایہاالذین امنو ادخلو فی السلم کافة

جب ہم اسلام میں کامل طور پر داخل ہو جائیں گے تو شخصیت کی وحدت اور سالمیت ہمیں مل جائے گی جو بڑے ادب کی اساس ہوتی ہے۔ آج تو ہم ان اعراب کی طرح ہیں جن کے لیے قرآن حکیم نے فرمایا۔ ہے: یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم

اور جن کے لیے یہ بھی ارشاد ہوا کہ وہ ابھی اسلام لائے ہیں اور ایمان ان کے قلوب میں داخل نہیں ہوا۔

حضرات مکرم! وقت تیزی سے گزر رہا ہے حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی اب سفر ہند کے لیے اپنے دولت کدے سے روانہ ہونے والے ہیں اور میں اس تحریر کے مناسب اختتام کی فکر میں ہوں۔

میں پورے یقین کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ کا گہرا ادبی نقطۂ نظر سے مطالعہ آپ کے راستے کے سارے کانٹے چن لے گا۔ قرآن کریم کا اسلوب ہمیشہ قائم رہنے والا معجزہ ہے۔ آخری دو پاروں کے سورتوں کے اسلوب کا عکس آج آپ کو

اردو کے علامتی اور جدید افسانوں اور تحریروں میں ملے گا۔ کہ ہم ایک قیامت سے گزر رہے ہیں۔ احادیث نبویؐ اور بالخصوص جوامع الکلم سے ہمیں وہ ڈھب حاصل ہو سکتا ہے کہ اظہار کی طنابیں کیسے کھینچی جا سکتی ہیں۔

قرآن حکیم نے انفس و آفاق دونوں کو اپنے دعوؤں کی صداقت ابھارنے کے لیے شہادت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ پس اپنی آنکھیں کھلی رکھیے' نئے آفاق آج ہمارے سامنے آر ہے ہیں۔ نئی کہکشاؤں کی خبر ہمیں مل رہی ہے۔

اور دوسری طرف اقبال ہی کے الفاظ میں آپ سے عرض کروں گا کہ۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

دعوت کا مرحلہ ہر اسلامی ادیب کے سامنے آئے گا۔ یہی ہمارے مسلمان ہونے کا تقاضا ہے۔ ہمارے لیے یہ عمل کچھ ایسا مشکل نہیں۔ قولِ حسن اور قولِ معروف کی وسعتوں سے قلب نظر آباد رکھیے کہ آپ کا قلم اِسی طرح دعوت کے بوجھ کو نشاطِ فکر میں بدل دے گا۔

قرآن حکیم اِس ہدایت کو ہم اپنا منشور بنا لیں کہ دعوت میں موعظت اور قولِ حسن کو 'پنائیں تو ہمارے اور ہمارے ادب کے شب و روز بدل جائیں گے۔ ہمارا ادب اس منزل تک پہنچ جائے گا جو اس کی تقدیر ہے یا جسے اس کی تقدیر ہونا چاہیے اور نبی اکرمؐ کے طریق کار کا اتباع ہمیں ان کے حضور بھی سُرخ رو کرے گا۔

دعوت اشارہ بھی ہے اور پکار بھی اور دوسروں کو اپنی نوائے سینہ تاب سے اپنی طرف مائل کرنا بھی۔ نغمہ بھی دعوت ہے اور فریاد بھی دعوت ہے۔

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
اے خاصہ خاصان رسل! وقت دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

یہ دعوت کے مختلف اسالیب ہے۔

حکمت کی وسیع اصطلاح میں ایک جہانِ معانی آباد ہے اس میں قاری یا سامع کی ذہنی سطح کا احترام بھی شامل ہے' آزادی اظہار کی اس آخری حد تک کا تعین بھی جس سے آگے بڑھا نہیں جا سکتا' اس میں عدل وانصاف کا مفہوم بھی ہے اور تناسب وتعاون بھی' حکمت جہل کی نفی بھی ہے۔ آپ حکمت کو اپنائیں گے تو ہر شے اور خیال کا صحیح اندازہ آپ کے فن کے دائرے میں آجائے گا۔

موعظت کے ساتھ حسنہ کا ٹکڑا بھی موجود ہے۔ وعظ میں انذار بھی ہے۔ اور مضر نتائج کی نشاندہی بھی۔ پھر ادب میں تنذیر کا پہلو آتا ہے تو اس لیے کہ دلوں میں نرمی بڑھے' آنکھوں کا نم تو آنکھوں کا وضو ہے' ادبی موعظت وعظِ مُلا سے مختلف ہے۔

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنئے
جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے
نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کر کوئی

اخلاقی مسائل بڑے شاعر کے ہاں اس کی آواز کے دائرے کو قطع کرتے ہوئے ہمارے اندر کی آواز بن جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ہمارے یہاں دین کے حقائق' اخلاقی تصورات انہیں علماء کے وسیلے سے ہماری ذات کا حصہ بنے جو ادب کے نقش گر تھے یا ہیں۔ سر سید حالی' شبلی' نذیر احمد' عبدالحلیم شرر' محسن کاکوروی' اقبال' سید سلیمان ندوی' ابوالکلام آزاد' مولانا عبدالماجد دریابادی' مولانا مودودی' مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ یہ نام مثال کی طور پر پیش کیے گئے ہیں' فہرست ساری میرا مقصود نہیں۔

پاکستان کی اردو نثر نے اخلاقی اقدار کو کئی حوالوں سے نئی جہت دی ہے۔ مختار مسعود' شیخ

منظور الٰہی، مولوی محمد سعید، ابن الحسن، یہ چند نام یاد آ گئے، خدا وہ دن لائے جب مجھے ان لوگوں کے بارے میں آپ کے سامنے گفتگو کرنے کا موقع ملے۔

آخری بات یہ ہے کہ دین ہی کے حوالے سے شاعر کی نوا وہ بادِ سحر بن جاتی ہے جو چمن کو بہار کا آئینہ بنا دے اور ادب میں حیاتِ جاودانی کی جھلک آ سکے۔ ہوس تو یک نفس دو نفس کی حیات رکھتی ہے اور اقدارِ عالیہ ہمیں اثبات عطا کرتی ہیں۔

۱۹۹۱ء

ادیب اور مملکت

(۱)

ادیب اور مملکت کی بحث اس اعتبار سے خاصی پرانی ہے کہ فرد اور مملکت کے رشتہ پر عہدِ یونان سے اب تک غور کیا گیا ہے اور یہ بحث ادیب کا احاطہ بھی کر لیتی ہے کیوں کہ ادیب فرد کی فردیت کا ترجمان رہا ہے۔

ادیب یا کسی بھی فرد کا مملکت سے کیا رشتہ ہے؟ اس سوال کے جواب کا تعلق ریاست کی ہیئت ترکیبی سے ہے۔ مطلق العنان بادشاہت یا ٹھیٹ اشترا کی ریاست میں فرد بادشاہ یا اشترا کی جماعت اور اشترا کی ریاست کے مقاصد کا آلۂ کار ہوگا۔ کسی جمہوری نظام میں ادیب مملکت سے وفادار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کی روشنی میں حکومت کے ان اقدام کی مخالفت بھی کر سکے گا جو مملکت کے جمہوری مزاج اور روایات کو بدلیں یا مجروح کریں۔

ہمارے دَور میں مملکت، حکومت اور قوم کی اصطلاحیں بڑی حد تک مترادف اصطلاحوں کی حیثیت سے استعمال کی جا رہی ہیں۔ اب ان اصطلاحوں کی جگہ سیاسی نظام (POLITiCAL SYSTEM) کی اصطلاح کو سیاسیات کے علماء استعمال کرنے لگے ہیں۔ وہ اس اصطلاح کو اس بنیاد پر ترجیح دے رہے ہیں کہ یہ اصطلاح کسی سماج میں انسان کی تمام سیاسی سرگرمیوں کا احاطہ کر لیتی ہے اور صرف حکومت کے اداروں تک محدود نہیں رہتی۔

سیاسی نظام کی اصطلاح معاشرے اور حکومت و مملکت کے رشتے کو معاشرے کی وحدت کے پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی ایک کوشش ہے۔ انسانی معاشرہ کا ارتقائی نقطہ ریاست یا مملکت ہے۔ کسی بھی معاشرے کو اپنی بقا اور ترویج کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریاست اسی قوت کی مظہر ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اسلامی معاشرے کی تشکیل کا آغاز کیا، لیکن یہ

حقیقت جلد ہی واضح ہوگئی کہ اسلام پر مکمل عمل کرنے کے لیے اقتدارِ سیاسی کا حصول لازمی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت' اسلامی ریاست کے قیام کی طرف پہلا قدم تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اس ریاست کی بنیاد رکھی اور یہ ریاست اللہ کے اس وعدے کے مطابق تھی کہ تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے' اللہ انہیں حکومت اور استخلاف فی الارض عطا کرے گا جس طرح اس نے پہلے کیا ہے۔ (سورہ النور: آیت ۵۵)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت اور نبوّت اور مذہب و مملکت کا آپس میں کیسا گہرا رشتہ ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کئی جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کو اقتدارِ ریاست عطا کیا گیا کیوں کہ انبیاء علیہم السلام معاشرے کی اصلاح کے لیے تشریف لاتے ہیں اور ریاست اُس قوت کا مظہر ہے، جو معاشرے میں انقلاب برپا کر دیتی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور حکومت و اقتدار کے رشتے کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ "الاسلام والسلطٰن اخوان توأمان (الدیلمی۔ عن جابر رضی الله تعالیٰ عنه") (اسلام اور حکومت توام بھائیوں کی طرح ہیں) دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اسلام بنیاد ہے اور مملکت اس کی حفاظت کرتی ہے۔

(۲)

مدینہ کی اسلامی ریاست ہمیں اسلام اور مملکت و سیاست کے اسی بنیادی رشتے کو یاد دلاتی ہے۔ بد قسمتی سے اسلام کی تاریخ عہدِ خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت اور شخصی حکومت کی تاریخ بن گئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اربابِ فکر اور اہل قلم کی اکثریت نے اسلام اور ریاست کے رشتہ کو فراموش کر کے درباروں سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ ویسے یہ اللہ کا انعام ہے کہ اسلام کے حقائق کو پیش کرنے والے ہر دور میں رہے' خواہ دار و رسن ہی ان کا مقدر ٹھہرا ہو۔

پاکستان کا قیام اسلام کی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے۔ ایک ایسا عظیم واقعہ جو پہلی صدی ہجری اور چودہویں صدی ہجری کو ہم رشتہ کر دیتا ہے۔ پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ اور اس جدوجہد کے قائد کے ارشادات اس حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں کہ پاکستان کے وجود میں آنے کا بنیادی مقصد'

اسلام کو اپنی زندگی اور ریاست کا مرکزی نقطہ بنانا تھا۔ ایسی مملکت جس میں وحی الٰہی کی روشنی میں معاشرے اور ریاست کی تفصیلات اور جزئیات مرتب کی جائیں۔

انسانی فکر پر اسلام کے عظیم ترین احسانوں میں یہ احسان بھی شامل ہے کہ اس نے سیاست کو بھی روحانیت عطا کردی۔ اسلام میں روحانیت صرف خدا اور بندے کے باہمی رشتہ تک محدود نہیں بلکہ یہ روحانیت فرد اور فرد، اور فرد و معاشرہ اور فرد و ریاست کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین اس طرح کرتی ہے کہ ایک طرف فرد کی شخصیت کا نشو و نما ہو سکے اور دوسری طرف ایسا سیاسی اور سماجی ڈھانچا قائم ہو سکے جس کی بنیادی خصوصیت توازن و عدل ہو۔ انسان ایک سیاسی اور سماجی وجود ہے اور اسی لیے اسلام فرد کو معاشرہ کے ایک رکن کے طور پر دیکھتا ہے۔ اسلام کی اس کُلیت نے فرد اور معاشرہ کی اس کشمکش کو ختم کر دیا جو دوسرے فکری اور سیاسی نظاموں میں ملتی ہے۔ اسلام میں سیاست کا تعلق امر و نہی کے نفاذ اور روکنے سے ہے۔ اسلامی مملکت رہنمائی کے ذریعہ لوگوں کے مصالح کی نگہداشت کرتی ہے۔ جب ہم اسلام سے دُور ہوئے تو سیاست میں تبلیس کے پہلو شامل ہوتے گئے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ آج ہماری زبانوں میں سیاست کا لفظ کن معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ فارسی اور اُردو میں سیاست گری کا لفظ سفاکی کے ہم معنی ہے اور کبھی ہمارے بزرگوں نے سیاست کو اخلاق اور سیرت اور تربیت کا شعبہ قرار دیا تھا (ملاحظہ ہو سلوک المالک فی تدبیر الممالک)

مسلمان مفکروں نے قرآن حکیم اور دانش نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں مملکت اور اس کے حدود کا تعین انسانی معاشرے کے پس منظر میں کیا۔ فارابی نے سیاست المدینہ میں انسانوں کے اجتماع اور باہمی تعاون کی ضرورت کو ریاست کی بنیاد قرار دیا۔ اخلاقِ ناصری میں بھی ہمیں انسانی تمدن کے فروغ کے لیے باہمی تعاون کی ضرورت، کا احساس دلایا گیا ہے اور ریاست اسی تعاون کا پُرقوت ادارہ اور مظہر ہے۔

(۳)

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ادیب اور مملکت کے رشتہ کا تعلق مملکت کی ہئیت اور مقاصد سے

بہت گہرا ہے۔ مملکت اور اسلام کے تعلق کی نشان دہی کے بعد مختصراً اسلامی مملکت کے مقاصد اور مزاج کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس گفتگو سے ادیب اور مملکت کا تعلق خود بخود واضح ہو جائے گا' کیوں کہ ادیب کا اصل کام انہیں مقاصد کو تخلیقی انداز میں پیش کرنا اور ایسی ذہنی وفکری فضا پیدا کرنا ہے جس میں یہ مقاصد کسی اور مزاحم طاقت سے نہ دبنے پائیں۔

اسلامی ریاست حُریتِ انسانی کی ضمانت ہے۔ قرآن حکیم نے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان فرمادیا ہے کہ ''ہم نے خواہ کسی کو حکومت و نبوت ہی کیوں نہ عطا کی ہو' اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں سے اپنی بندگی کرائے۔'' اسلامی ریاست میں وحی الٰہی کو بنیادی اور رہنما اصولوں کی حیثیت حاصل ہے۔ ان رہنما اصولوں کو رسول اپنے عمل کے ذریعہ عملی قالب میں ڈھالتا ہے اور اجمال کو تفصیل عطا کرتا ہے۔ وہ مملکت جو اللہ اور رسول کے احکام کو نافذ کرائے اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے' لیکن اسلام اللہ کے سوا کسی اور کو مطاع قرار نہیں دیتا۔ خود رسول کی اطاعت' اللہ کی اطاعت کی عملی صورت ہے۔

سورۂ النساء کی اٹھاونویں (۵۸) آیت میں اسلامی ریاست کا یہ بنیادی اصول بیان کردیا گیا ہے۔

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی'
اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر
تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اللہ اور رسول
کی طرف (اس معاملہ کو) پھیر دو۔''

یوں اسلام میں اولی الامر کی اطاعت مشروط ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لاطاعه فی معصیه انما اطاعه فی المعروف (بخاری و مُسلم)

''معصیت میں کسی کی اطاعت نہ کرو' اطاعت صرف معروف باتوں میں کی جائے گی۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہ بات بھی نکھر کر سامنے آ گئی کہ حکومت ایسی بھی ہو سکتی ہے جس کے بہت سے احکام معروف کے دائرے میں آتے ہوں اور کچھ احکام معصیت کے زمرے میں شامل ہوں۔ ایسی صورت میں یہ اربابِ علم' دانشوروں اور ادیبوں کا

فریضہ ہوگا کہ وہ معروف کو منکر سے الگ کر دکھائیں۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں جو نیکی کی طرف بلائیں،
معروف کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔" (آیت ۱۰۴)

خواتین و حضرات!

مجھے اس آیت مبارکہ میں ادیب اور مملکت کے رشتہ کی ایک دُنیا آباد نظر آتی ہے اور اسی کے ساتھ یہ آیت ادیبوں، عالموں اور دانشوروں کے لیے منشورِ الٰہی کا درجہ رکھتی ہے۔ ادب اپنے تمام سماجی پہلوؤں اور ممکنات و مضمرات کے ساتھ اعلانِ حق اور دعوتِ معروف ہی تو ہے۔ ادب روشنیٔ فکر و نظر کا نام ہے۔ ادب اندھیروں، ظلمتوں اور بے انصافیوں کے خلاف جہاد ہے۔ وہ جماعت، جو اُمتِ مسلمہ میں خیر کی دعوت دے گی، معروف کا حکم دے گی اور منکر سے روکے گی، ظاہر ہے کہ اس کا ہراول دستہ ادیبوں پر مشتمل ہوگا۔

خواتین و حضرات!

میں نے خالصتاً ادبی نظریاتی بحث چھیڑنے کی جگہ اسلامی مملکت کے حوالے سے ادیب اور مملکت کے رشتہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ہمارا اور ہماری تمام سرگرمیوں کا حوالہ اور (FRAME OF REFERENCE) ہے۔ میں نے اس گفتگو میں نظریہ اور دینی مملکت اور نظریاتی مملکت جیسی اصطلاحوں کے استعمال سے بھی گریز کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ مغربی اصطلاحیں ایسا لباس ہیں جن کا اسلام کی قامتِ موزوں سے کوئی تعلق نہیں۔

اس مرحلہ پر مناسب ہوگا کہ میں اسلامی مملکت کے مقاصد کی طرف بھی چند اشارے کردوں۔ اسلامی سیاسی نظام، یعنی اسلامی مملکت، انسان کو غیر اللہ کی اطاعت سے نجات دلوا کر حریتِ انسانی کے لیے ایک ضمانت بن جاتی ہے۔ تکریم آدم، مساوات اور حریت انسانی وہ بنیادی اقدار ہیں، جن پر اسلامی معاشرہ اور ریاست کی عمارت قائم ہے۔ ان اقدار کی تخلیقی تعبیر و توضیح اور ان کا تحفظ اسلامی مملکت میں ادیب کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ یہی وہ اقدار ہیں جن کی عظمت اور فوقیت

کا احساس صدیوں بعد خسران وابتلاء میں مبتلا انسانیت کو اب ہوا ہے۔

اسلامی مملکت ایک فلاحی مملکت ہوگی۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے ”بقا صرف ان چیزوں کے لیے ہے جن میں نوع انساں کے لیے منفعت ہو۔“ یہ بات بارش کے سلسلہ میں کہی گئی ہے اور ادب پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے کیوں کہ ادب ذہن انسان کے لیے بارش کے قطروں کی طرح شادابی کا پیغام بر ہے۔

اس جملہ معترضہ کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ بات ہو رہی تھی اسلامی مملکت کے فلاحی پہلو کی۔ اسلام میں فلاح کا تصور روٹی، کپڑے اور مکان تک محدود نہیں، بلکہ اسلامی ریاست کا فریضہ یہ بھی ہوگا کہ وہ اپنے شہریوں کی صلاحیتوں اور امکاناتِ ذہنی و عملی کی تکمیل اور اظہار کے وسیلے فراہم کرے۔ اسلامی مملکت تو اپنے آپ کو اپنے حدود میں بسنے والے انسانوں کی فلاح تک ہی محدود نہیں رکھتی، بلکہ ہر ذی حیات کی فلاح اور زندگی کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ خدا کی قسم اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو اس کی ذمہ داری عمر پر ہوگی۔

اسلامی مملکت اپنے شہریوں کی زندگی، عزت اور حیثیتِ عرفی کے لیے بھی ذمہ دار ہوگی۔ انسانی زندگی کی حرمت کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے کہ ”جس نے ایک انسان کی جان بچائی یوں سمجھو کہ اس نے نوع انسانی کی جان بچالی اور جس نے ایک انسان کو ناحق قتل کیا گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا۔“ شہریوں کی حیثیت عرفی کا اس درجہ احترام کیا گیا کہ لعن طعن پر لعنت بھیجی گئی اور حکم دیا گیا کہ ”دوسروں کو بُرے ناموں سے نہ پکارو۔“ قرآن حکیم نے انسان کو اس کے تمام بنیادی حقوق شہریت عطا کیے ہیں۔ ان میں اس کے گھر اور خلوت کا احترام بھی شامل ہے۔ مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں داخل نہ ہوں۔

خواتین و حضرات!

اسلامی مملکت میں ادیب ان تمام مقاصد کے حصول اور تکمیل کے لیے اپنا فن اور قلم استعمال کرے گا۔ اسلام نے اندازِ کلام کے سلسلہ میں جو رہنما اصول عطا کیے ہیں ان کا تعلق صرف گفتگو

اور بول چال ہی سے نہیں بلکہ تحریر اور انداز بیان سے بھی ہے" قولوا للناس حسنا۔" لوگوں سے اچھی باتیں کہو۔ اس ارشاد باری تعالیٰ کے الفاظ میں ادیب کی منزل موجود ہے اور اچھی باتیں اچھے الفاظ میں ادا کی جائیں۔ یہی قرآنی اصطلاح میں قول معروف ہے۔

قرآن کریم ضبط نفس اور تزکیۂ نفس پر زور دیتا ہے۔ اس بنیادی اصول سے ہمیں یہ ادبی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ادیب کو بھی اپنے اظہار کے اسالیب وضع کرنے میں ضبط اور تزکیہ سے کام لینا چاہئے۔ یوں ریاضت اور فن اور نفس ادب' اسالیب بیان اور نفس مضمون' یہ سب باتیں ضبط کے تحت آ جاتی ہیں۔ اقبال نے یہی بات اپنے اسلوب خاص میں یوں کہی تھی۔

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اسلامی مملکت کے تین مقاصد ایسے ہیں جن کی اہمیت کے پیش نظر ان کا ذکر آخر میں الگ سے کر رہا ہوں۔ یہ مقاصد ہیں مساوات' انصاف کا حق اور حکومت میں شرکت کا حق۔ اسلامی مملکت میں ان حقوق کے تحفظ کے لیے ادیبوں کو اپنے تمام تر شعور اور آگہی کے ساتھ قلم اٹھانا ہوگا۔ عدل اسلام کا ایک نہایت بنیادی تصور ہے۔ اس کائنات کی تخلیق سے لے کر مسائلِ حیاتِ انسانی تک' ہر جگہ عدل کا اصول کارفرما نظر آتا ہے۔

اسی عدل کا منطقی ثمرہ مساوات ہے۔ اسلامی مملکت اپنے تمام شہریوں کے ساتھ مساوات برتے گی۔ کسی خاص خطے یا خاندان میں پیدائش کے اتفاق یا حادثہ کی بنا پر کسی کے ساتھ نہ تو ترجیحی سلوک کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کے خلاف امتیاز برتا جا سکتا ہے۔ کسی عبوری مدت میں مختلف علاقوں کے درمیان توازن اور مساوات کی خاطر پس ماندہ طبقہ یا علاقے کو عام ملکی اور قومی سطح پر لانے کی کوشش بالکل الگ چیز ہے۔ اس عدل اور مساوات کے حصول کا عملی ثبوت یہ ہوگا کہ مملکت کے افراد کو بلا کسی امتیاز کے کارِ حکومت میں شرکت کے مواقع حاصل ہیں یا نہیں اسلامی مملکت میں کاروبارِ حکومت میں شرکت اس کے شہریوں کا حق ہے' اور یہ ادب کا مقدس فریضہ ہوگا کہ وہ اس حق کے اصول کے لیے اپنے قلم کو موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرے تاکہ "شارکھم فی الامر"

(آل عمران:۵۹)اور امرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ:۳۸) پر عمل ہو سکے۔ یہ مشاورت موثر ہونی چاہیے، حکمرانوں کی مرضی کے تابع نہیں۔ اور آج مسلم ممالک میں ہمیں شوریٰ کی کمی ہر جگہ بہت مہیب صورت میں نظر آتی ہے۔ ان قرآنی احکام اور خلفائے راشدین کی مثالوں کے ہوتے ہوئے حکومت میں عوام کی شرکت سے خوف غیر اسلامی اور خام فکر کی دلیل ہے۔ ادیبوں کا آج سب سے بڑا کام یہی ہے کہ وہ حکومت میں عوام کی شرکت کے لیے ذہنی اور فکری جدوجہد کریں۔

آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ میں یہ عرض کروں گا کہ اسلامی مملکت کے مقاصد کی تکمیل میں ادیبوں سے زیادہ موثر کردار شاید اور کوئی ادا نہیں کر سکتا' کیوں کہ اسلام کے تخلیقی عناصر اور حیات آفریں پیغام کو پوری طرح سمجھنے کے لیے تخلیقی ذہن درکار ہے۔ تخلیقی ذہن جو ادیب کی دولت بیدار ہے۔

افادات

۱۔ اسلام کا نظریہ حیات۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ ترجمہ: قطب الدین احمد ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد دہم۔ دانش گاہ پنجاب لاہور۔

۳۔ الفاروق۔ شبلی نعمانی۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔

4- Comparative Politics.A Developmental Approach by Almond and Powell, Oxford and IBH Publishing co.

5- Authority and the Individual by Russell, Bertrand, George Allen and Unwind Ltd.

زبان‘ زندگی اور اظہار

(اطراف جوانب کا جائزہ)

’’کن فیکون‘‘ ’’اس نے کُن کہا اور کائنات وجود میں آ گئی‘‘ میں تخلیق کائنات کی ساری کہانی سمٹ آتی ہے۔ زبان انسان کے لئے اللہ کا سب سے بڑا عطیہ ہے اور اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو خدا کو انسانوں کے معاملے میں شامل کرنے سے گریز کرتے ہیں تو آپ زبان کو انسان کی سب سے بڑی اور اہم ایجاد سے تعبیر کریں گے اور زبان کیا ہے؟ یہ بنیادی طور پر لفظوں کا مجموعہ ہے۔ مگر اللہ سے گریز کر کے ہم کہاں جائیں گے؟ اور کتنی دور جاسکتے ہیں۔ شاید والٹیر نے کہا تھا کہ اگر کوئی خدا نہ ہوتا تو انسان کو خدا ایجاد کرنا پڑتا۔ یہ اثبات‘ وجود خداوندی کی بڑی بلیغ دلیل ہے بشرطیکہ پڑھنے والے زبان اور انداز و اسالیبِ کلام سے واقف ہوں۔

کیا آپ زبان کے بغیر انسانی زندگی اور سرگرمیوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟ مشینوں کی آواز شہروں میں ہر طرف گونجتی ہے‘ گاڑیوں کی آوازیں زندگی کے رواں دواں ہونے کا استعارہ ہیں لیکن اگر انسان دس منٹ کے لئے بھی ساری دنیا یا کسی ایک انسانی بستی میں خاموش ہو جائیں تو ہم سے کتنے لوگ ایسی خاموشی کو سہار سکیں گے؟ ہوا کی طرح تکلم کی دولت اتنی عام ہے کہ ہم اس کی اہمیت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔

زبان انسانی زندگی کا لازمی اور ’’ناگزیر‘‘ حصہ ہے۔ ہم اوسطاً ایک گھنٹے میں چار پانچ ہزار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کانفرنسوں‘ دفتروں‘ تعلیمی اداروں اور دکانوں سے لے کر خواب گاہوں تک زبان کے استعمال کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ زبان کے استعمال کا اعلیٰ ترین مرحلہ ادب ہے۔ ادب میں انسانی روح کی بلندیاں‘ جذبات کا ارتعاش‘ اشتعال اور تہذیب سبھی کا اظہار نظر آتا ہے۔ زبان کے ذریعے ہی انسان اپنے ان جذبات و افکار کا اظہار کرتا ہے جن

سے اس کی رفعت، بے غرضی، آفاق گیر محبت اور اس کی انسانیت کا اندازہ ہوتا ہے اور زبان کے ذریعے ہی انسان دوسروں کے خلاف اپنی نفرت کا زہر اگلتا ہے۔ طلاق کے مقدموں میں فریقین کا ایک دوسرے کو اخلاقی طور پر عریاں کرنا، ہڑتالوں اور سیاسی مظاہروں میں مخالفین کی کردار کشی، عالم جنوں میں ذہن کی بے ربطی کا اظہار ان میں سے ہر چیز کا تعلق زبان سے ہے۔ زبان کے ذریعے ہی ہم ماضی سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں، حال کے مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور مستقبل کے خاکے کو نئی نسل کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ زبان ہی کے ذریعے ہم اپنے فکری سفر کو جاری کرتے ہیں۔ ایک نسل جس مرحلے تک انسانی فکر کو پہنچاتی ہے، اگلی نسل وہیں سے اس کو زبان کے ذریعے آگے بڑھاتی ہے۔ لکھے ہوئے حرف کی مدد سے ہم اپنے کتب خانوں اور اپنے گھروں میں سقراط ارارسطو، غزالی، رومی، البیرونی، اور ابن خلدون سے لے کر اقبال، ٹیگور، جوش، فیض، ٹی ایس ایلیٹ، فاکنر تک کتنے ہی لوگوں سے کلام کرتے ہیں۔ کتاب خوانی بھی یک طرفہ معاملہ نہیں۔ ہم بڑے مصنفوں اور مفکروں سے مکالمہ کرتے ہیں۔ سرسید، حالی اور شبلی جیسے اکابر ہمارے لئے ماضی کے نام نہیں بلکہ ایک اعتبار سے ہمارے ساتھی اور دوست ہیں۔ ہم سے باتیں کرتے ہیں، ہم میں حوصلہ پیدا کرتے ہیں اور جہاں اندھیرا گہرا ہوتا ہے وہاں ہمارے ساتھ وہ مشعل بہ دست راہ طے کرتے ہیں۔

الفریڈ کورزبسکی (Alfred Korzybski) نے دوسرے جانوروں کے ساتھ انسان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انسان چیزوں کو بہتر بنا سکتا ہے جانور یہ نہیں کر سکتے، انسان ترقی کرتا ہے جانور نہیں کرتے، انسان پیچیدہ سے پیچیدہ تر آلات ایجاد کرتا ہے جانور نہیں کرتے، انسان مادی اور روحانی دولت و تجربات کا خالق ہے، دوسرے حیوان نہیں ہیں، انسان تہذیب کا معمار ہے دوسرے حیوان نہیں ہیں۔''1

انسان اور دوسرے حیوانوں میں یہ فرق زبان اور صرف زبان کی وجہ سے ہے۔ انسان نے اپنے تجربات کو زبان کے ذریعے محفوظ کیا، اپنی ایجادات کے طریق کار اور تکنیک کو زبان

کے ذریعے دوسری نسل تک پہنچایا۔ انسان کی تمام روحانی اور مادی فتوحات اور ترقیوں کا سرچشمہ اس کا ذہن اور زبان ہے۔ تہذیب کی عمارت زبان کی بنیاد پر قائم ہے۔ ایک نسل کے کمالات، دانش اور فنی مہارت زبان کے ذریعے آنے والی نسلوں تک منتقل ہوتی ہے۔ زبان نے انسان کو کیا کچھ عطا کیا ہے اور انسان کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ اس پھیلی ہوئی اور انتہائی وسیع داستاں کو ارونگ جے لی نے ایک چھوٹے سے جملے میں سمیٹ لیا ہے:

it has given him the Earth.۲

زبان نے زمین کو انسان کے زیرنگیں بنادیا' زبان نے انسان کو جہاں گیر بنادیا۔ یہ زمین' اس کے خزانے' اس کے اسرار' اس کے امکانات سب کچھ انسان کے دائرہ علم میں زبان کے وسیلے ہی سے آئے ہیں۔

زبان نے انسان کے تجربوں اور ترقیوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کسی بھی زبان کی لغت سے لگا سکتے ہیں۔ ایسی لغت جو تاریخی اصولوں پر مرتب کی گئی ہو اور جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ کون سے الفاظ زبان میں کب داخل ہوئے۔ ''قمر نورد'' اور ''خلانورد'' کے الفاظ گزشتہ تیس برسوں کے اندر ہماری زبان کا حصہ بنے ہیں۔ Cloning کا لفظ تو اپنے نئے معانی' امکانات اور حطرات کے ساتھ ۱۹۹۶ء کا لفظ ہے۔ اب اس کے لئے ہمیں کوئی لفظ اور اصطلاح تخلیق کرنی ہوگی۔ ایک مختصر اصطلاح تو ''ہم زادگی'' ہوسکتی ہے اور یہ نئے مفاہیم کا بڑی حد تک احاطہ بھی کر رہی ہے۔ پھر ''ہم زاد'' کے پرانے لفظ کو نئے معانی مل گئے ہیں۔ اب ''ہم زاد'' لغوی اور حیاتیاتی سطح پر بھی ''ہم زاد'' بن گیا ہے۔

انسانی زبان کی سب سے بڑی صفت اور خصوصیت اس کی بازآفرینی ہے۔ یہ جملے جو میں نے اس تحریر میں لکھے ہیں اس سے پہلے اس طرح کبھی نہیں لکھے تھے' اگرچہ یہ مضمون میں نے پہلے بھی ادا کیا ہوگا۔ اسی طرح زبان سے متعلق یہ باتیں آپ نے مختلف الفاظ اور اسلوب میں پہلے بھی پڑھی ہوں گی یا سوچی ہوں گی' لیکن ان الفاظ اور سیاق وسباق میں پہلی بار آپ کے سامنے آئی ہیں' لیکن ان کی تفہیم میں آپ کو کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ اس کا سبب زبان کی باز

آفرینی کی صفت ہے۔ محدود معانی میں کہا جاتا ہے کہ دوسرے جانور بھی اپنی زبان رکھتے ہیں۔ کتا بھونکتا ہے اور اس کے بھونکنے میں صورت حال کے مطابق تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ اپنے مالک کا استقبال کرتے ہوئے کتے کا بھونکنا' کتیا کے ساتھ اظہار محبت کے لئے کتے کا آواز نکالنا' کسی اجنبی کو دیکھ کر کتے کا بھونکنا' حملہ کر تے ہوئے اس کی غراہٹ اور ''بھونک'' وغیرہ۔ آپ کتے کے ہر صوتی اشارے کو کسی لفظ کی طرح سمجھ لیجئے۔ لیکن یہ صوتی اشارے چند ہیں۔ بہت محدود...... دس بارہ...... اور ان میں ہزاروں سال سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ لیکن انسانی زبان میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے' ذخیرۂ لغت بدلتا رہتا ہے' الفاظ کے معانی بدلتے رہتے ہیں۔ خواص عربی کا لفظ ہے۔ عوام و خواص' دوا کے خواص اور پھر ''خواص آئی'' خواص کے اور مفہوم بھی ہوں گے' لیکن ان کی تلاش کا یہ موقع نہیں۔ صرف تیسری صورت پر غور کیجئے۔ ''خواص آ گئی'' یہاں خواص خالص اردو کا لفظ ہے جسے کوئی عرب نہیں سمجھ سکتا۔ ہم نے جمع کو واحد بنالیا او پھر اسے ''تانیث'' کے مرتبے سے مُشرف کردیا۔ ''اخبار'' کہاں ہے...... خبر کی جمع کو ہم مجلّہ (Newspaper) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

زبان کی تاریخ میں مختلف مرحلے آتے رہتے ہیں۔ ایسے دور جن میں اسالیب میں تبدیلیاں آتی ہیں' لفظوں کے معانی بدلتے ہیں۔ اور ایسے دور جن میں اسالیب میں استحکام رہتا ہے۔ سرسید تو ''جدید دور زبان'' سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کی زبان آج کی زبان سے خاصی مختلف ہوگئی ہے۔ تذکرہ اولیاؤں کا' ذکرِ ولی کا...... اب مضاف' مضاف الیہ کی ترتیب مختلف ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ قدیم ترتیب بھی خصوصی اثرات پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ شاعری کے دامن میں بالخصوص' قدیم اسالیب کو پناہ مل جاتی ہے۔ ''تک'' کی جگہ ''تلک'' آج بھی شاعری کا حصہ ہے۔ اسی طرح مضارع کا استعمال:

دل ہے کہ فراق اب تک دامن کو چھڑائے ہے

کلیم عاجز اور کئی شاعروں نے مضارع کو اپنے اسلوب کا حصہ بنالیا ہے:

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اسی طرح لفظ ''تُو'' پر غور کیجئے۔ اب روزمرہ کی گفتگو میں ''تو'' نے ''تم'' اور ''آپ'' کے لئے جگہ خالی کردی ہے' مگر ادب اور شاعری کی دنیا میں یہ ایک زندہ اور توانا لفظ ہے۔ ایسا لفظ جو روایات اور معانی کی دنیا ہے۔ اس لفظ کے بارے میں قدرے تفصیلی گفتگو آنے والی سطور میں کی جائے گی۔

زبان کی نحوی ترتیب اور اس کا تنوع اور معانی سے اس ترتیب کا رشتہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم بنیادی طور پر اپنے آپ کو لفظ تک محدود رکھیں گے۔ اگرچہ ترتیب کا ذکر بھی اشارتاً آجائے گا۔

لفظ کا رشتہ معنی سے ہے اور لفظ کی دنیا عجائبات اور طلسمات کی دنیا ہے۔ لفظ کسی بھی زبان کی اساس ہوتے ہیں۔ اشیا کا علم انسان کو لفظ اور بالخصوص ''اسم'' کے ذریعے ملا ہے۔ ''ریڈیو'' ایک چھوٹا سا لفظ ہے' لیکن یہ لفظ ہمیں انجینئرنگ' طبعیات' لسانیات کی وسیع دنیا تک لے جاسکتا ہے۔ ''شیر'' کہتے ہی انسانی ذہن میں کتنی تصویریں آجاتی ہیں۔ کسی سننے والے کے ذہن میں کوئی مرد جری آجائے گا:

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے

ضیغم کے لفظ کو رد کرنے کی ضرورت نہیں۔ نثر میں کہہ لیجئے کہ پھر شیر میدان جنگ میں آگے بڑھا۔ کسی کے ذہن میں شیر کے لفظ سے چڑیا گھر کا تصور آسکتا ہے۔ ''قیدیٔ شیر'' کسی کا تلازمۂ خیال اسے شیر کے کسی مجسمے تک لے جاسکتا ہے۔

ہر لفظ کے ساتھ معنوی مضمرات ہوتے ہیں اور ہر لفظ ہمارے تلازمۂ خیال کے وسیع سلسلے کا حصہ بن جاتا ہے۔ ''سرخ'' کا لفظ ہمیں انقلاب اور خون کی یاد دلا سکتا ہے یا پھر ہمارے ذہن کو گلاب کے پھولوں سے مہکا سکتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں بھی لفظ کے یہ پہلو اور امکانات نظر آتے ہیں۔ انسان کی اس صفت کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے کہ وہ ہر چیز کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ یہی بات '' کلام' کے بارے میں کہی جاسکتی ہے ہر آدمی اپنی بات وضاحت اور قوت کے ساتھ کہنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں محنت بھی کرتا ہے۔ آپ ہر دن گداگروں کو

دیکھتے ہیں کہ وہ کس قوت اور فصاحت کے ساتھ اپنی محتاجی اور ضرورت کو بیان کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں ککڑی بیچنے والے اپنی ککڑیوں کو ''لیلیٰ'' کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں کہہ کر اور یہی آوازیں لگا کر خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ کراچی میں بھی یہ حسن گفتار، مختلف انداز و اسلوب اور مختلف لسانی پس منظر کے ساتھ نظر آتا ہے۔

''لال لال تربوز۔ لے لو لے۔ مٹیار کے ہونٹوں کی سرخی لئے۔''

''بڑا میٹھا آم، شربت کا جام۔''

مثالیں میں کیوں دوں، آپ اپنے حافظے کو آواز دیجئے۔ دکان داروں، فقیروں اور دوسروں پیشہ وروں سے کیسے کیسے جملے، کیسے استعارے آپ نے سنے ہیں۔ الفاظ ادب ہی میں نہیں عام زندگی میں بھی مختلف سطحوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ عام آدمی چاہے آپ سے فصاحت کے اصولوں پر گفتگو نہ کر سکے مگر وہ یہ اصول اپنی زندگی میں عملی طور پر برتتا ہے۔ اسے قافیہ کا لفظ، ممکن ہے نہ معلوم ہو مگر وہ ہم صوت الفاظ کی قوت، حسن اور استعمال کو خوب جانتا ہو۔ سیاسی نعروں میں بھی لسانی پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ عام بولنے والا لفظوں کے معانی کے ساتھ ان کی آوازوں کی گرفت کو خوب جانتا ہے:

''قرض اتارو، ملک سنوارو''

۱۹۹۸ء گندم کا سال

ملک خوش حال

''کسان خوش حال''

''خود اگاؤ، خود کھاؤ''

''ربِ کعبہ نصرت بھیج، رحمت بھیج''

''قاضی کی پکار، لشکر کی للکار''

''وفاق کی زنجیر، بے نظیر بے نظیر''

''نواز شریف اپنا شیر، باقی سب ہیر پھیر''

شیکسپیئر کے عظیم ڈرامے ''ہیملٹ'' میں پولینس اپنے آقا سے پوچھتا ہے:

''میرے آقا! آپ کیا پڑھتے ہیں؟''

'ور ہیلمٹ جواب دیتا ہے:

''لفظ' لفظ' لفظ۔''

میں نے لفظوں کے معنوی مضمرات کا ذکر کیا۔ اب ایک اور مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے مترادفات و مرادفات کا مسئلہ۔ ادبی مطالعے میں تو یہ ایک نازک اور اہم مسئلہ ہے' عام زندگی اور عام گفتگو میں بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر لفظ معنویت کا ایک دائرہ رکھتا ہے۔ ''مرادف'' بالکل ہم معانی الفاظ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی دو لفظ ہم معنی نہیں ہوتے مگر اردو کا معاملہ مختلف ہے۔ اس میں ایک ہی چیز کے اسم مختلف زبانوں سے آئے ہیں۔ ''ان کے ہم معانی ہونے میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟'' آپ یہ سوال کرسکتے ہیں اور بجا طور پر' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے الفاظ بھی اب اپنے اپنے محور معنوی پر رقص کرتے ہیں۔ ''اوس'' اور ''شبنم'' پر تو مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر'' میں گفتگو کی ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

یہ دونوں مصرعے آپ کے سامنے ہیں۔ ''اوس'' کی جگہ ''شبنم'' اور ''شبنم'' کی جگہ ''اوس'' کر کے دیکھئے اور پھر خود ہی ہنس پڑیئے...... پھر معاملہ اور آگے بڑھتا ہے۔ ''اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔'' ذرا ''اوس'' کی جگہ امیدوں پر ''شبنم'' ڈال کر دیکھئے۔ محاورے میں ادنیٰ ترین تحریف کی اجازت آپ کی زبان آپ کو نہیں دے گی۔

''آسمان' فلک' چرخ' آکاش' سما اور سماوات'' یہ سب ایک معنی کے لئے اسم ہیں اور مکمل طور پر ہم معنی' لیکن کیا یہ سچ مچ' مرادف اور ہم معنی ہیں؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ ان الفاظ میں فلک کے ساتھ ہی مصائب اور آفات کا سلسلہ ذہن میں آجاتا ہے۔ ''بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا'' ہندی میں ''آکاش'' کا معنوی شیڈ (shaed) یعنی ظل لونی اردو

سے مختلف ہے۔ اردو والے جب یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو آسمان کے حسن کے اظہار کے لئے ''آ کاش یہ تاروں کا جال'' (مجاز) سما اور سماوات تقابل اور فرق یا زمین و آسماں کے رشتے کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ ''از ارض تا سما'' ان الفاظ میں سب سے نیوٹرل (لا لونی) لفظ آسمان ہے:

''آج آسمان ابر آلود ہے۔''

''بارش ہوئی تو آسمان دُھل کر نکھر گیا۔''

ویسے آسمان بھی فلک کے معانی میں استعمال ہوتا ہے:

یہ فتنہ آدمی کیخانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

جس طرح ہم میں سے کوئی غیر ضروری بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھانا پسند نہیں کرے گا' اسی طرح زبانیں بھی مترادفات میں سے کچھ کو ترک کر دیتی ہیں' یا پھر ان کو معنوی فرق کے ساتھ استعمال کرنے لگتی ہیں۔ علامہ دتاتریہ کیفی نے اپنی مشہور کتاب ''کیفیہ'' کے تیسرے باب کا عنوان ''مرادفات یا مترادف الفاظ'' قائم کیا ہے اور لفظوں کے کئی جُگ (گروپ) درج کر کے ان کے معنوی فرق پر گفتگو کی ہے۔

(الف) رنج۔غم۔افسوس۔تاسف

(ب) خوش۔شاد۔بشاش۔باغ باغ

(ج) انس۔الفت۔محبت۔عشق

(د) وبدا۔جھجک۔سانسا۔کھٹکا۔بھچک۔دھڑکا۔سہم۔سناٹا۔ڈر

یہ بحث ''کیفیہ'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ایسے مرادفات و مترادفات کی طویل فہرست بنائی جاسکتی ہے۔ علامہ کیفی نے فیصلہ ذوق سلیم پر چھوڑ دیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں ایسے قریب المعنی الفاظ کا فرق بڑے ادیبوں اور بالخصوص شاعروں کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔ بجنوری مرحوم نے سچ کہا ہے کہ بڑے شاعروں کا کلام الفاظ کے باب میں میدان حشر ونشر

ہے۔''صرف' فقط' بس' خالی' محض اور نرا'' یہ قریب المعنی الفاظ ہیں جو استثنیٰ حصر کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔اب ''نرا'' کا استعمال سمجھنا ہو تو اکبر الٰہ آبادی سے رجوع کیجئے:

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

الفاظ کے کتنے ہی اور پہلو ہیں جن پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔ کیا لفظ کی آواز اور معنی کے درمیان کوئی فطری تعلق ہوتا ہے؟ جن الفاظ کے مختلف معانی ہوتے ہیں' انہیں ایک ہی لفظ سمجھا جائے یا وہ مختلف الفاظ ہیں؟ مستعار الفاظ کا تلفظ اصل زبان کے مطابق ہوگا یا دوسری زبان میں آنے کے بعد بدلا ہوا تلفظ اس زبان کا معیاری تلفظ ہوگا؟ کیا ہم مستعار الفاظ میں معنوی تصرف کرسکتے ہیں؟ لیکن یہ سب مسائل اس مطالعے سے تعلق نہیں رکھتے......ایک مسئلے کی طرف مختصر اشارے مناسب ہوں گے (لیکن ''گنجینۂ معنی'' کے طور پر ہی لفظ کا مطالعہ اس تحریر کا مقصد ہے) جس بات کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اب جدید لسانیات کی روشنی میں لفظ' معنی کی پہلی یا بنیادی اکائی نہیں ہے بلکہ یہ حیثیت معنیہ (phoneme) کو حاصل ہوگئی ہے۔ بول چال اور آواز کی پہلی اکائی صوتیہ ہے' مثلاً ''آ'' ایک صوتیہ ہے لیکن یہ صوتیہ' معنیہ بھی ہے۔''آ'' کسی کو بلانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ ایک لفظ بھی ہے۔ آنا' کا فعل امر اور یہ ایک مکمل جملہ بھی ہے' جس میں ''تو'' محذوف ہے۔اب ہم ''لفظ'' کا مطالعہ صوتیہ' معنیہ اور لغویہ (lexeme) کی تین سطحوں پر کرتے ہیں' بلکہ چار سطحوں پر' چوتھی سطح فہمیہ (sememe) کی ہے۔ لفظ شیر کی مثال دی جاچکی ہے کہ اس ایک لفظ سے ایک ہی معنی کی کتنی شکلیں ذہن میں آتی ہیں ان میں سے ہر شکل ایک فہمیہ ہے۔

(لغویہ اور فہمیہ دونوں اصطلاحیں' راقم الحروف کی وضع کردہ ہیں)

لغویہ لفظ کی وہ شکل ہے جو لغت میں اختیار کی جاتی ہے۔''چور'' ایک معنیہ اور ''بازار'' ایک لغویہ ہے اور یوں لغت کی ایک اکائی ہے۔ یہ لغویہ دو معنیوں اور لفظوں کا مجموعہ

ہے۔ ''بازاری'' ایک لفظ ہے جو دو معنیوں پر مشتمل ہے۔ ''بازار'' ایک آزاد معنیہ ہے اور ''ی'' پابند معنیہ ہے اور بازاری ان دونوں معنیوں کا مجموعہ ہے۔ جدید لسانیات کے اس انداز سے لفظ و معنی کا مطالعہ زیادہ سائنسی اور گہرا بن گیا ہے۔ اب سابقہ اور لاحقہ کی جگہ ہم معنیہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ''آزاد'' اور ''پابند'' کے فرق سے معنیہ کے مطالعے میں کچھ اور وسعت آ گئی ہے۔

اور آخری بات یہ کہ ''ادائیگی'' یا ''طرز ادا'' کو بھی ایک معنیہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے شاعر نے اس بڑی لسانی حقیقت اور لسانی مطالعے کے اس گہرے نکتے کو بہت پہلے پیش کر دیا تھا:

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی!

ہم ایک ہی جملے یا شعر یا مصرعے کو مختلف انداز سے ادا کر سکتے ہیں اور طرز ادا کے اختلاف سے معانی بدل جاتے ہیں، یوں طرز ادا کو معنیہ کی حیثیت حاصل ہے۔

کیا وہ لاہور گیا تھا؟ ''کیا'' حرف استفہام ہے اور اس کی مدد سے اس سوالیہ جملے کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے مگر آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں (لہجے میں سوال پیدا کر کے 'گیا تھا' کی ادائیگی کو بدل کر) وہ لاہور گیا تھا؟

اسی جملے کو اتار چڑھاؤ کے بغیر مستقیم انداز میں کہیے تو یہ بیانیہ جملہ ہو جائے گا:

مشہور شعر ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

پہلے مصرعے کو استفہامیہ انداز میں بھی پڑھا جا سکتا ہے اور بیانیہ انداز میں بھی۔ معانی میں جو فرق پیدا ہوگا، اس تک رسائی مشکل نہیں۔ افسوس ہمارے ہاں شعر خوانی کی روایت اور فن ختم ہو گیا۔ ادب، بالخصوص شعر کی قرأت کے مسئلے سے ہم نے لاتعلق ہو کر کیا کچھ کھویا ہے، اس

کا حساب اور اندازہ کون کرے گا؟

حوالے

(1) Al fred Korzbski, "Manhood of Humanity" New York. 1921, p.186 (quoted by Lee 1.j in Human Habits in Human Affairs)

(2) Irving J.Lee "Language Habits in Human Affairs" Harder and Brothers Publishers, New York, 1941, p.6

زبان وادب کی تدریس کے مسائل

سوال: ڈاکٹر صاحب، حسبِ دستور سب سے پہلے تو آپ اپنے حالاتِ زندگی بیان فرمائیے۔

جواب: چلئے حالات قیامِ پاکستان سے شروع کریں۔ ہندوستان میں بظاہر کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا کہ جس کی بنا پر پناہ گیر کے طور پر پاکستان آتا' سوائے اس کے کہ ایک خواب دیکھا تھا۔ پاکستان۔ اور اپنی ارض موعودہ میں کون رہنا نہیں چاہتا۔ پھر حسنین (حسنین کاظمی) چلے آئے تھے۔ ہمارے تعلقات ایسے تھے کہ الگ الگ رہنے کا تصور ہی نہیں آتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں آ گیا۔ ایس ایم کالج' اُردو کالج اور اسلامیہ کالج میں پڑھا۔ یہ وہ دَور تھا کہ جب کالج طالب علموں کو دیکھتے تھے کہ کس کی پوزیشن آ سکتی تھی۔ اسلامیہ کالج میں اسٹوڈنٹ لیکچرر رہا اور باضابطہ یونی ورسٹی نے پڑھانے کی اجازت دی تھی۔ پڑھتا بھی تھا پڑھاتا بھی تھا۔ ایسی شاید کوئی اور مثال نہیں۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں ہمایوں' ساقی' ادب لطیف' اُردو اور ماہ نو میں خاصے مضامین شائع ہو چکے تھے۔ شاہد بھائی (شاہد احمد دہلوی) ایک ادارہ تھے اور انہوں نے بہت ہمت افزائی کی۔

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک اسلامیہ کالج میں پڑھایا پھر اُردو کالج چلا گیا ۱۹۵۹ء سے کراچی یونی ورسٹی میں ہوں۔ اپنے بارے میں بات کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے (مگر ڈاکٹر صاحب بعض دفعہ یہ مجبوری ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت بھی یہی مرحلہ درپیش ہے۔ مشرف احمد) ۱۹۶۶ء سے ۶۸ء تک امریکہ میں رہا۔ کولمبیا یونی ورسٹی سے ایم اے لسانیات کی سند لی۔ پھر دو سال کے لیے پاکستان واپس آیا اور پی ایچ ڈی کی سند لی۔ پھر جاپان چلا گیا اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک اوسا کا یونی ورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف فارن اسٹڈیز میں اُردو اور مطالعہ پاکستان کا پروفیسر رہا۔

زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے اقتدار سے یا منصب سے طبیعت کو کوئی مناسبت

نہیں،اس میں میرا کوئی دخل نہیں،اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ایسی طبیعت دی جو بنیادی مسائل پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔اس میں میری خاندانی روایات اور خانقاہی مزاج کا بھی دخل ہے آپ کو شاید معلوم ہو کہ حضرت ثاقب کانپوری مرحوم میرے والد تھے۔ وہ بڑے شاعر تھے اور اس سے بھی بڑے انسان تھے۔مومن کی ذات میں آفاق کیسے گم ہوتے ہیں،اس کی مثال۔

سوال: اکیڈمی آف لیٹرز سے بھی تو آپ نے استعفیٰ دے دیا تھا اور ابھی کراچی یونی ورسٹی کے صدر شعبہ کے منصب سے بھی آپ نے علیحدگی اختیار کرلی۔

جواب: جی ہاں اکادمی والی بات تو پرانی ہوگئی۔وہ بھی ایک اصولی اختلاف تھا۔حال میں شعبے میں ایک بے ضابطہ تقرر ہوا تو میں نے تکنیکی وجوہ پر اس تقرر کو رُکوانے کی جگہ صدارت شعبہ سے استعفیٰ دے دیا۔بعض صاحبان طنزاً کہتے ہیں کہ مجلسِ انتخاب کی کارروائی پر تو آپ نے دستخط کر دیئے۔یہ ایک تکنیکی غلطی تھی مگر میں نے دانستہ اپنے لیے یہ راہ عمل چن لی تھی۔ جلسے سے باہر آتے ہی استعفیٰ دے دیا۔اس تقرر میں ملوث لوگوں سے میں وہی کہتا ہوں جو ابسن کے ڈرامہ سوسائٹی کے ستون کی ہیروئن نے ہیرو سے کہا تھا کہ کیا تم میں کوئی ایسا جذبہ نہیں کہ تمہیں جھوٹ کے زنداں سے نجات دلائے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب ہمارے ملک میں مختلف سطحوں پر زبان وادب کی تعلیم دی جارہی ہے۔ ان کے درمیان کوئی ربط ہے یا نہیں؟

جواب: اس کا جواب نفی میں ہے اور میں آپ کی بات کو پھیلاتے ہوئے یہ کہوں گا کہ ابتدائی مدارس میں زبان کی تدریس کے لیے جو وقت دیا جاتا ہے وہ ناکافی ہے۔ ہمارے بچے کتابوں کا بوجھ لے کر چلتے ہیں اور مشہور فلم "ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم" یاد آنے لگتی ہے۔میرا اپنا خیال ہے کہ ابتدائی تعلیم میں زبان کی کتاب کے ذریعے ہم تاریخ،جغرافیہ،اخلاقیات اور ماحولیات کی تعلیم دے سکتے ہیں۔یوں نصاب اور کتابوں کا بوجھ کم ہوسکتا ہے۔جیسے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی اُردو کتابوں میں زبان کے ساتھ ساتھ تاریخ،جغرافیہ،نباتیات اور حیوانیات پر بھی اچھا مواد ہوتا تھا۔اگر زبان

یوں پڑھائی جائے تو پھر ریاضی کی کتاب درکار ہوگی۔ ہماری ایک اور مجبوری یہ ہے کہ ہم ایک مزید زبان پڑھائیں۔ آج کتابیں خوب صورت چھپ رہی ہیں لیکن ان کا معیار بہت پست ہے۔ زبان کی اغلاط بہت ہیں۔ بچوں کے لیے ہمارے ہاں بہت نہیں لکھا گیا۔ بچوں کے لیے جو اچھی نظمیں لکھی گئیں وہ ہماری کتابوں میں نہیں۔ ہماری کتابوں کے مولف ادبی ماضی اور نصابی کتابوں کی روایت سے واقف نہیں ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کا نام مرتبین کے لیے قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ میرے خیال میں کلاسیکی ادب سے شناسائی ڈل اسکول میں ساتویں آٹھویں میں ہونی چاہئے۔ یہاں، ہم زبان کی تبدیلیوں کے ساتھ کلاسیکی ادب سے بچوں کو روشناس کر سکتے ہیں۔

چارلس لیمب جیسے آدمی نے شیکسپیئر کی کہانیاں بچوں کے لیے لکھیں ''شیکسپیئر ری ٹولڈ (Retold)۔

میری تجویز یہ ہے کہ اس (وسطانیہ) سطح پر درسی کتاب کے علاوہ سرسری مطالعے کے لیے اڑتالیس سے لے کر اسی صفحات تک کی کم سے کم چھ کتابیں شامل ہوں اور ان کتابوں سے بیس فیصد سوال پوچھے جائیں۔

میری بات اس سے واضح ہوجائے گی کہ باغ و بہار، الف لیلیٰ کی کہانیوں، نذیر احمد کے ناولوں کی تلخیص بچوں کے لیے کی جائے یہ چند نام مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں نویں اور دسویں جماعت سے ہمیں اصناف ادب سے موثر طور پر روشناس کرانا چاہیے مثلاً مثنوی، رباعی، افسانہ، ڈرامہ۔

میں نے غزل کا دانستہ یہاں ذکر نہیں کیا۔ غزل کا آپ تعارف حالی کی بعض اخلاقی غزلوں سے کرا سکتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس سطح پر غزل کے موضوعات طالب علم نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ ادب محض تفہیم زبان کا مسئلہ نہیں۔ انسان کی زندگی کی تفہیم کا مسئلہ ہے۔ اب وہ بچہ جس کی زندگی میں عشق کا تجربہ آیا ہی نہیں وہ ایسے شعر کیسے سمجھے گا

دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

اس میں کوئی لفظ مشکل نہیں ہے لیکن بچے کا اس تجربہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر ہم غزل کو لے سکتے ہیں۔ فکری شاعری کو لے سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے ہائی اسکول ہو یا انٹرمیڈیٹ، وہی مصنف وہی اصناف، صرف انتخاب بدل جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی نظمیں، غزلیں اور نثر پارے بھی مشترک ہوتے ہیں۔ تو یوں سمجھئے کہ درسی کتابوں کی تیاری میں اکتالیس سال میں ہم نے کھویا ہے پایا نہیں۔ میں جب طالب علم تھا تو دسویں جماعت میں سرسری مطالعہ کی کتاب افسانے کا مجموعہ تھی۔ پریم چند سے لے کر عصمت چغتائی تک سب ہی اس میں تھے۔ تو اب ہمارے ہاں یہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہونا یہ چاہئے کہ ہائی اسکول، کالج اور یونی ورسٹی کی تدریسی کتابوں میں ایک ربط ہو۔ مثلاً بی اے کی سطح پر میں سمجھتا ہوں کہ شخصی خاکوں کا ایک انتخاب لازمی اُردو کورس میں ہونا چاہئے کیوں کہ اچھے آدمیوں کی زندگی اور کردار کی جھلکیاں اخلاقیات کا موثر ترین سبق بن سکتی ہیں۔ بی اے اختیاری اُردو میں ہم اُردو میں پاکستانی نثر کا اُردو پاکستانی نظم کا ایک اچھا انتخاب دے سکتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد کئی اصناف نے فروغ پایا ہے، جیسے مزاح، سفرنامہ، خاکہ نگاری اور انشائیہ۔ بہت اچھی خودنوشتیں لکھی گئی ہیں اور ثقافت کے مسائل پر کبھی کسی اور دور میں اتنا غور نہیں کیا گیا تھا۔ پاکستانی اُردو نثر سے متعلق مجموعے میں ان ساری اصناف کا ایک اچھا انتخاب ہوسکتا ہے۔ ادب کی تدریس کے مسائل سے پہلے یہ طے ہونا چاہئے کہ ہمیں کیا پڑھنا ہے۔ پہلا اور سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہی ہے کہ کیا پڑھنا ہے۔

اب ایم اے کے نصاب کی طرف آجائیں۔ وہی ۳۵، ۴۰ سال پہلے کا نصاب جاری و ساری ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ طالب علموں کی دو قسمیں ہوگئیں۔ ایک یونی ورسٹی میں پڑھتے ہیں، دوسرے خارجی امیدوار۔ میں نے اپنی صدارت کے دوران مجلس نصاب کو بارہا اس طرف متوجہ کیا۔ مجلس کے ارکان نے اتفاق تو کیا لیکن کام نہیں کیا۔ بی اے اختیاری اور بی اے لازمی کے کورس پر کام ہوگیا لیکن بوجوہ وہ کتابیں ابھی نہیں چھپیں۔

ایم اے میں خارجی یا بیرونی طلبہ کا تو وہی کورس چل رہا ہے لیکن یونی ورسٹی کے باضابطہ طلباء کے نصاب میں میں نے اپنے دور میں تبدیلیاں کرائیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اختیاری کورس شروع ہوئے۔ مثلاً پہلے سرسیّد کا مطالعہ ہوتا تھا۔ ہم نے یہ کیا کہ لڑکا اپنے مزاج کے مطابق سرسیّد، میر، غالب، اقبال میں سے کسی ایک کا مطالعہ کرے۔ اسی طرح ایسے نئے کورس ہم لے کر آئے جیسے ''ادب کا دوسرے علوم سے تعلق'' یا ''پاکستان میں ادب کے مسائل'' یہ سب اختیاری ہیں، اسی طرح کراچی یونی ورسٹی نے زندہ لوگوں کی طرف سب سے پہلے توجہ دی، بی اے اور ایم اے کی حد تک۔

سوال: ڈاکٹر صاحب، اب مسئلہ یہ آتا ہے کہ کیا ڈگری کالجوں اور جامعہ میں ادب کی تدریس کے طریقے سے آپ متفق ہیں اور کیا وجہ ہے کہ لوگوں کا ادبی ذوق، ان کا لکھنا پڑھنا یا زبان سے ان کی شناسائی اتنی کمزور ہے، آج معاشرے میں کتنے لوگ ہیں جو زبان کو موثر طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟

جواب: یہ بڑی تشویش ناک صورت حال ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کثیر اللسانی معاشرے میں زبان کی تحصیل اور تدریس کے مسائل مختلف ہوتے ہیں، ہم نے ایک اُردو ماحول میں پرورش پائی۔ زبان اور شعر و ادب کا ماحول اسکول ہی سے نہیں گھر سے بھی ملا۔ پاکستان میں صورت حال کچھ مختلف ہے۔ اب زبان کی تدریس کے طریقے انقلابی تبدیلی چاہتے ہیں۔ نصاب کے بارے میں، میں نے جو کچھ کہا اس پر آپ نے غور کیا ہوگا کہ میں نے ابتدائی یعنی پرائمری تعلیم میں زبان کی تدریس اور اُس کے موضوعات کی توسیع کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ زبان دراصل ایک بہتر معاشرے کی تعمیر میں فرد کے کردار کو بھی متعین کرتی ہے۔ مثلاً ہمیں اپنے بچے کو ابتدائی مدارس میں یہ سکھانا چاہیے کہ ٹیلی فون پر گفتگو کیسے کرے، چاہے اصلی ٹیلی فون نہ ہو۔ کھلونا ٹیلی فون استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ یوں طالب علم کو سکھایا جائے کہ جو بات کرنی ہو تین منٹ کے اندر کیسے اختصار سے کی جاسکتی ہے، پہلے اسکول

میں بچوں کے جلسے ہوتے تھے۔صدر بھی بچہ'معلن بھی بچہ' مضامین بچے پڑھتے تھے' اساتذہ سُنتے تھے اور مشورے دیتے تھے۔ ہر کلاس کے قلمی اخبار نکلتے تھے۔آج بھی یہ عمل لازم ہے۔ بچے ہی سب کچھ نہیں کرلیں گے۔ان کے مضامین کی اصلاح کیجئے۔پانچویں جماعت سے ہر کلاس کا ماہانہ آٹھ صفحے کا اسکول میگزین لکھا جانا چاہئے۔ہمیں اپنے بچپن میں کلاس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے میگزین کی یاد آتی ہے اس کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ یہ طریقہ اب اگر ہم لے آئیں تو بچوں کا تخلیقی جوہر اُبھرے گا۔اُردو کے اساتذہ اگر دلچسپی لیں تو ان تحریروں میں سے بہتر تحریریں منتخب کر کے بچوں کے رسالوں کو بھیجی جاسکتی ہیں۔اس سے بچوں کا معاشرے سے رشتہ قائم ہو جائے گا۔اب تو کمپیوٹر کتابت کے ذریعہ اسکول کے بچوں کے رسالے شائع کر سکتے ہیں۔اسی طرح میگزین کے علاوہ اساتذہ اور بچوں کے اشتراک سے کتابوں کی اشاعت بھی ممکن ہے۔مثلاً مینوالا گرلز اسکول کراچی نے بچوں کی تین کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں نے اپنے بزرگوں سے' نانیوں' دادیوں سے پاکستان بننے کی جو کہانیاں سُنی تھیں انہوں نے اپنے طور پر وہ کہانیاں لکھی ہیں۔اس کے بعد اساتذہ اور طالبات دونوں کی کہانیوں پر مشتمل دو کتابیں اور چھپیں۔

آج اساتذہ میں مطالعے کا کوئی ذوق نہیں۔اسکول سے لے کر یونی ورسٹی تک جو پڑھتے ہیں یا لکھتے بھی ہیں مجبوراً۔مثلاً یونی ورسٹی کے اساتذہ مضامین اس لیے لکھتے ہیں کہ وہ اسسٹنٹ پروفیسر' ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر بن سکیں۔لیکن لکھنے کے عمل میں ان کے لیے کوئی لذت نہیں ہے۔سب کچھ فارموں کی خانہ پُری کے لیے کیا جارہا ہے۔پھر اساتذہ کے اپنے تلفظ اور متن پڑھانے کا مسئلہ ہے۔ایم اے کی سطح پر متن تو بالکل ثانوی بن گیا ہے۔ زیادہ تر تنقیدی سوالات کیے جاتے ہیں۔یہی نتیجہ ہے کہ میر و غالب پر تنقید تو ہورہی ہے لیکن ان کے اشعار کا مطلب نہیں لکھ سکتے۔متن کے مطالعے اور اس کی تدریس پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ادب میں جو استعارے آتے ہیں' تلمیحات آتی ہیں ان کے پس

منظر سے اساتذہ بھی پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔ ضروری ہے کہ مختلف سطحوں پر اساتذہ کے ریفریشر کورس ہوں جن میں تدریسی پہلوؤں سے انہیں روشناس کرایا جائے۔ انجمن اساتذہ اُردو قائم کی گئی تھی، افسوس یہ کہ ہم نے شروع میں تو بہت معرکے کے جلسے کیے جن میں مجنوں صاحب، لیث صاحب جیسے لوگوں نے بہت اچھی اور مفید تقریریں کیں لیکن پھر دیوار رزق کو چاٹنے والے اساتذہ کو اس کی فرصت نہیں ملی۔ ان کو مورد الزام بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایک بڑا نثری سا شعر ہے عارف جلالی کا اور جو مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔ ہماری زندگی کی صورت حال اسی پیرایۂ بیان میں ہی ادا کی جاسکتی ہے

وہاں خاک عہد وفا نبھے، وہاں خاک دل کا کنول کھلے
جہاں زندگی کی ضرورتوں کا بھی حسرتوں میں شمار ہے

اب نتائج اتنے بھیانک ہیں کہ ایک دن اچانک میں نے ایم اے پریوس کے طلباء سے پوچھا کہ ردیف اور قافیہ کیا ہے تو آپ یقین جانیے کہ پچاس میں سے صرف دو طلباء جانتے تھے۔ اس دن مجھے یہ احساس ہوا کہ زندگی کے چالیس، بیالیس سال یوں ہی ضائع ہو گئے۔ جب کہ قیام پاکستان سے پہلے ہر مہذب آدمی جس نے اُردو ادب باضابطہ پڑھا ہو یا نہ پڑھا ہو، یہ باتیں جانتا تھا۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اساتذہ کو خود ذوق وشوق نہیں اور دوسرے یہ کہ نصاب کے ایک مرحلے کا دوسرے مرحلے سے کوئی تعلق نہیں۔

سوال: آج کالج میں اور جامعات میں اُردو ادب کی تدریس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور اُردو لازمی کیوں ہے؟ سائنس والوں کے لیے بھی اُردو لازمی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سائنس کے طلباء کے لیے اُردو پڑھنا کیوں ضروری ہے؟

جواب: اصل میں سائنس کے ذریعے انسان نے کائنات کو مسخر کیا ہے اور بشری علوم اور ادب کے ذریعے وہ اپنی کائنات کو سمجھ سکتا اور خود غرضیوں اور شہوات (یہاں یہ لفظ میں عربی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں) پر قابو پا سکتا ہے۔ اپنی تہذیب کر سکتا ہے اور یہ تہذیب بعض

بشری علوم اور ادب ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اپنی معرفت اور اپنے آپ کو جاننا انسان کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اپنے لیے اور کائنات کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ جب کہ اس کی فتوحات کا سلسلہ خلاء تک پہنچ گیا ہے، آپ دیکھیے کہ مغرب کی سائنس کی یونی ورسٹیوں میں بھی ادب کی تعلیم وسیع پیمانے پر ہوتی ہے۔ مغرب کا سب سے بڑا ماہر لسانیات چومسکی کسی عام یونی ورسٹی میں نہیں بلکہ ایم آئی ٹی میں ہے۔

کامرس میں بی کام میں اُردو شامل نہیں ہے وہاں بھی شامل ہونی چاہیے۔ اس سوال کے جواب کا پہلو یہ بھی ہے کہ بہر حال ہر فرد خواہ اس کا پیشہ کچھ بھی ہو، معاشرے کا رُکن ہوتا ہے اور معاشرے میں ارتباط اور باہمی ربط کا سب سے موثر وسیلہ زبان ہے۔ تو کالجوں میں یہی آگہی اور ربط، ادب کی تعلیم کا سبب ہے۔ یہی اس کا مقصد بھی ہے۔ ادب کا جو طالب علم ہوگا وہ ایک مہذب اور ایسا تہذیب یافتہ فرد ہوگا جو اپنی تاریخ سے واقف ہوگا، حال کے چیلنجوں کو سمجھتا ہوگا، مستقبل پر نظر ہوگی۔

آج ہم ایک صدی سے دوسری صدی میں داخل ہو رہے ہیں جتنے بڑے چیلنج سامنے آ رہے ہیں ان کو حل کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ ادب کی بھی ضرورت پڑے گی تاکہ دنیا ایک زیادہ محفوظ جگہ بن سکے، آنے والی نسلوں کے لیے۔

سوال: جو تحقیق ہو رہی ہے اور جس انداز سے ہماری درس گاہوں میں تدریس ہو رہی ہے اس سے یہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جو آپ نے ابھی بتائے ہیں؟

جواب: میرا جواب نفی میں ہے۔ ایک لگے بندھے طور پر اساتذہ پڑھا رہے ہیں۔ کالجوں میں اور یونی ورسٹیوں میں بہت سے اساتذہ کو آپ دیکھیں گے ان کے ہاتھوں میں اپنے زمانۂ طالب علمی کی نوٹ بکیں ہیں۔ علم کو تازہ کرنے کی طرف توجہ نہیں۔ کیا نئی کتابیں نہیں آ رہی ہیں؟ اور اساتذہ مل کر کوئی ایسا اجتماع نہیں کرتے جس میں تدریس کے مسائل پر غور کریں۔ تجربہ کار اساتذہ کسی سبق یا کسی موضوع کی تدریس کا عملی مظاہرہ کریں۔ پھر متن

پڑھانے کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ باغ و بہار، فسانہ عجائب وغیرہ پڑھنے کے بجائے تنقید پڑھ لی۔ تو اب انہیں کیا معلوم کہ اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کا طرزِ فکر کیا تھا۔ زندگی کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ بیشتر نقاد پلاٹ پر، کہانی پر، کردار پر زور دیتے ہیں تو یوں ادب کی تدریس کا مقصد ہی پورا نہیں ہوتا۔ کسی معاشرے کو تاریخ کے ذریعے یا کسی اور بشری علم کے ذریعے اس طرح نہیں سمجھا جاتا جیسے ادب کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔ ادب میں تو کسی عہد اور اس کے مسائل کے ساتھ ساتھ اس عہد کا سانس لیتا انسان بھی ہوتا ہے۔ مثلاً پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو نہری پانی کا معاہدہ ہے وہ ایسی انسانی قدر و قیمت نہیں رکھتا جو منٹو کا افسانہ یزید رکھتا ہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی پر جو بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں انسانوں کے مسائل خطوط غالب یا فغان دہلی کی طرح نہیں ملتے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے تدریس کے طریقوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ریفریشر کورس ہوں بلکہ پاکستان کی سطح پر کالجوں اور یونی ورسٹی کے اُردو اساتذہ کی ایک انجمن ہونا چاہیے جیسی ہندوستان میں ہے اور یہ انجمن تنظیمی مسائل کے ساتھ ساتھ تدریس کے مسائل پر غور و فکر کرے۔ ہندوستان اور ان ملکوں سے رابطہ قائم کرے جہاں اُردو پڑھائی جارہی ہے۔ غیر ملکی طلبہ کے لیے ہم نے اُردو میں درسی کتابیں تیار نہیں کیں۔ امریکہ اور کینیڈا میں ہی ایسی کتابیں چھپیں۔

بارکر صاحب، چوہدری نعیم نے خاصا کام کیا ہے۔ انگلستان میں بھی کام ہوا ہے حالانکہ یہ تو ہمارے کرنے والا کام تھا۔ ہم نے کراچی یونی ورسٹی میں کامیابی کے ساتھ غیر ملکیوں کو اُردو پڑھائی لیکن جو مواد استعمال کیا اسے کتابی شکل میں پیش نہیں کرسکے اور اس کا سبب ظاہر ہے۔ اس میں کوئی تجارتی منافع نہیں۔ جامعہ کراچی یا پاکستان کی کسی اور جامعہ میں کتابوں کی اشاعت کو اب تک منظم طور پر نہیں کیا گیا۔ مختلف سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کام کرسکتے تھے۔ ان کے ذریعے جب بھی کام کرانے کی کوشش کی گئی تو اس میں ناکامی ہوئی۔

سوال: جواب تو آپ نے تفصیلی طور پر دے دیا لیکن تحقیق کی بات رہ گئی کہ پاکستانی جامعات میں تحقیق کی صورت حال ادب اُردو میں کیا ہے۔ بھارت سے اس صورت حال کا کیسے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ بھارت کے نام کے ساتھ ہی ایک اور بات ذہن میں آتی ہے وہاں زندہ ادیبوں' شاعروں پر پی ایچ ڈی کا کام ہو رہا ہے۔ اس میں بہت پھیلاؤ ہے' پاکستان کی جامعات میں زندہ لوگوں پر کام کرنے کی اجازت کیوں نہیں ملتی؟

جواب: جب آپ کہتے ہیں جامعات میں تحقیق کا کام۔ اس سے میرے ذہن میں دو باتیں آتی ہیں۔ اساتذہ کیا کام کر رہے ہیں اور کیا کام کرا رہے ہیں۔ عام طور پر اساتذہ کا معاملہ یہ ہے کہ پی ایچ ڈی کے لیے برا بھلا مقالہ لکھ لیا۔ مشکل سے پانچ فی صد اساتذہ لگن سے تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ باقی کے لیے تحقیق میں خود کوئی نشاط اور سرور نہیں۔ ان کا مسئلہ گریڈ اور ترقی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں اس لیے کہ ایسوسی ایٹ اور پروفیسر وغیرہ بن جائیں اور ان مضامین کے لیے ادبی معیار یا رسائل کی قید کا بھی بسا اوقات احترام نہیں کیا جاتا۔ اپنی ہر تحریر کو تحقیق کہنے پر اصرار ہوتا ہے جو ظاہر ہے درست نہیں۔ ترقیٔ منصب کے لیے درخواست دینے والے اخبارات کے مضامین بھی شامل کر لیتے ہیں۔

آج ہمیں اپنی جامعات میں کوئی حافظ محمود شیرانی نظر نہیں آتا۔ کہنے کو تو وہ آخری وقت تک لیکچرر رہے لیکن کم ہی پروفیسر ایسے ہوں گے جو اِن کے گُھٹنے تک پہنچ سکیں۔ یہ تو بڑی مثال ہے آج کوئی ڈاکٹر عبداللہ' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' ڈاکٹر عبادت بریلوی' ان میں نظر نہیں آتا کہ ان میں کام کرنے کی ایسی ہی لگن ہو۔ مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ جامعات سے باہر جن افراد نے کام کیا ہے وہ ان سے زیادہ موقر ہے۔ اب رہا جو کام کرایا جارہا ہے تو اب پی ایچ ڈی کرنے کا بہت رجحان ہے اور شاید یہ کوئی بے رحمی نہ ہو جو میں کہوں کہ اس کا سب سے قوی سبب تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ ہے۔

بعض لوگ تو بعض اپنے دوستوں کی مدد سے مقالہ مرتب کر لیتے ہیں اور اس کا اندازہ

زبانی امتحان کے وقت ہوتا ہے۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے مقالے میں کیا لکھا ہوا ہے۔ یہ صورت حال مختلف یونی ورسٹیوں میں مختلف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب یونی ورسٹی اور کراچی یونی ورسٹی ایک اچھے علمی و تحقیقی معیار کو باقی رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

اب رہی بات ہندوستان کی۔ وہاں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامعات پی ایچ ڈی کرنے کے کارخانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ اُردو کی حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ پی ایچ ڈی کر کے اپنے اپنے علاقوں میں استاد ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی کم و بیش ساٹھ یونی ورسٹیوں اور ان سے متعلق کالجوں میں اُردو پڑھائی جا رہی ہے۔ اس کا سبب بغیر کسی تعصب کے یہ ہے کہ ہندوستان کو دُنیا کے سامنے اپنا ایک سیکولر چہرہ پیش کرنا ہے اور ہندوستان میں اُردو کے فروغ کا سبب بھی قیامِ پاکستان ہے۔ ہندو سیاست میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ وہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو احساس زیاں دلانا چاہتا ہے کہ تم کہتے ہو تم نے اپنے کلچر کے تحفظ کے لیے پاکستان قائم کیا۔ اب دیکھو کہ ہم ہندوستان میں اُردو کی ترقی کے لیے کیا کر رہے ہیں، بہت ساری اُردو اکیڈیمیاں اُردو حلقوں کے لیے ایک رشوت کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ ادیبوں کو کتابیں چھاپنے کے لیے رقم دیتی ہیں۔ میری بات بے وزن اور بے دلیل نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ویسے ہی ہے جیسے آپ ملاقاتی کمرے آرائشی پودا لگا دیں جس کو بار بار دھوپ میں نکال لیں مگر جڑیں نہیں ہیں۔ کوئی زبان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک ملازمت اور روزگار سے اس کا رشتہ نہ ہو۔ اُردو کے اس حق سے اس کو وہاں محروم رکھا گیا ہے۔ مصنف اپنی کتاب چھپوا کر اپنے پاس رکھتا ہے۔ پڑھنے والے نہیں ہیں۔ یو پی میں اور دہلی میں بھی اُردو کو دوسری زبان نہیں بنایا گیا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر آپ سے پھر کسی وقت گفتگو کریں گے۔ براہ کرام اب ہندوستان میں تحقیق کے موضوع پر آجائیں؟

جواب: ہندوستان میں پی ایچ ڈی کے لیے ہر آدمی پر تحقیق ہو رہی ہے۔ ایسے لوگ جن کا بلند قد و قامت نہیں ہے ان پر بھی پی ایچ ڈی ہوئی ہے۔ دوسرے درجے کے لکھنے والوں پر کام ہو رہا ہے جن کا کوئی ادبی مستقبل نہیں ہے۔ زندہ آدمیوں پر اعلیٰ درجے کا تنقیدی مضمون تو لکھا جاسکتا ہے لیکن تحقیق شاید ممکن نہیں۔ مثلاً ان کو دیکھنے کے لیے وقت کا تناظر درکار ہے وہ شاید ابھی نہیں۔ ایک دُوری چاہیے، وقت چاہیے۔ جیسے پورٹریٹ کو دیکھنے کے لیے، دور ہٹ کر جب صحیح مقام تناظر سے آپ دیکھتے ہیں تو تصویر نظر آتی ہے۔

ایک اور قباحت۔ زندہ آدمی پر جب آپ لکھتے ہیں تو گویا طے کر لیتے ہیں کہ اب اس کا کام مکمل ہو چکا ہے اور اب اس کے ارتقا کی کوئی گنجائش نہیں ہے یا آپ سمجھتے ہیں کہ اب اس کا تنزل شروع ہو گیا۔ اور اب اس کا بھی تعین بیشتر ادبی شخصیتوں کی حد تک نہیں ہوسکتا کہ ان کے کیا ادبی اثرات مرتب ہوں گے۔ میری دانست میں کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن پر ان کی زندگی میں بھی لکھا جاسکتا ہے ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے، ٹھہر جاتے ہیں یا ان کے اثرات ان کی زندگی میں ہی مرتب ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں شاعری میں میرے ذہن میں جو نام آتے ہیں، جوش، راشد اور فیض، افسانہ نگاروں میں کرشن، عصمت، منٹو اور بیدی ان پر فیصلہ دیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی انتہا تک پہنچ گئے تھے۔

قرۃ العین حیدر کے سلسلے میں دو رائیں ہوسکتی ہیں۔ وہ خاتون اپنا معیار آپ ہیں، اس اعتبار سے آگ کا دریا کے بعد ان کے حوالے سے اُردو ناول پر پی ایچ ڈی کا کام ہوسکتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قرۃ العین حیدر پر اب بھی پی ایچ ڈی کا کام اس لیے نہیں ہوسکتا کہ ان کا نقطۂ عروج ابھی نہیں آیا۔ وہ اپنے آپ کو دہراتی نہیں۔ ان کا ہر ناول ایک الگ دُنیا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''آخر شب کے ہم سفر'' ''آگ کا دریا'' سے زیادہ مشکل، اہم اور مکمل ناول ہے اور اس میں آزادی سے کچھ پہلے کے حالات کو کئی کرداروں کی مدد سے سمجھایا گیا ہے اور مصنفہ کی غیر جانب داری کی انتہا ہے کہ ہم انگریز آئی سی ایس اور ہندوستان کے اینگلو انڈین

کرداروں کے کرب کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔

اب ہم پھر واپس آتے ہیں۔ ہندوستان میں پی ایچ ڈی کے معیار پر، تو ہندوستان میں تو عالم یہ ہے کہ دو صاحبان نے داغ اور امیر مینائی پر جو مقالے لکھے ہیں، ان میں سے ایک مقالہ یقیناً دوسرے مقالے کی نقل ہے۔ نام بدل دیا ہے، اشعار بدل دیئے ہیں۔ پہلا باب بدل دیا ہے۔ باقی ساری تنقید وہی ہے اور ستم یہ ہے کہ ان دونوں مقالوں کے ممتحن مشترک تھے، یعنی ایک ہی تھے۔

سوال: ادبی شخصیتوں پر پی ایچ ڈی کا کام ہو رہا ہے؟

جواب: ادبی شخصیتوں پر ہمارے ہاں ایک ادبی تحقیق کا سانچہ بن گیا ہے کہ ادبی شخصیتوں پر کام ہو رہا ہے حالانکہ جب برصغیر میں تحقیق کا آغاز ہوا تو اداروں، تحریکوں اور دوسرے بڑے موضوعات پر نظر تھی۔ مثلاً پہلے جو تین مقالات لکھے گئے۔ ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ان کے مقالے پہلے مقالے تھے۔ میں سمجھتا ہوں آج یہ صاحبان اپنے مقالے کے موضوعات منتخب کرتے تو شاید مختصر موضوعات پر لکھتے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے مسائل، ادوار اور تحریکوں پر توجہ دینی چاہئے اور ان معاشرتی مسائل پر جو ادب کے بغیر سمجھے نہیں جا سکتے۔ ایسے موضوعات ہوں جن میں کوئی پرابلم ہو، کوئی مسئلہ ہو، اگر کسی دور پر لکھ رہے ہوں تو دور بہت وسیع نہ ہو۔ مثلاً جدید اُردو غزل پر کئی مقالے لکھے گئے جن میں کم و بیش وہی شاعر ہیں۔ لیکن یہ کہ جدید اُردو غزل کیسے وجود میں آئی، اس کے عوامل کیا ہیں اس پر کسی نے بھی وہ توجہ نہیں دی جو دینی چاہئے تھی۔ کوشش کی گئی ہے کہ یہ رجحان کچھ بدلے، چنانچہ ایک امیدوار سے میں نے پاکستانی شاعری میں پاکستانی قومیت کے اظہار پر کام کرایا۔ ایک خاتون افسانے میں شہر اور دیہات کی کش مکش پر کام کر رہی ہیں یا مثلاً اُردو افسانوی ادب کے حوالے سے پاکستانی قومیت کا ایک خاتون جائزہ لے رہی ہیں اور اس میں اس مخالف نقطہ نظر کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو ہندوستانی ادیبوں کی تحریروں میں ملتا ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کو ہم ایک مزاح نگار کے طور پر پڑھتے ہیں لیکن ان کے ہاں عورت کی مظلومیت کا جو احساس ہے اس کی مدد سے ان کے عہد کی متوسط مسلمان عورت کے عمرانی مطالعے پر لکھا جا سکتا ہے یا عصمت کو بھی شامل کر لیں کہ ان کے ہاں یہ مسائل کیوں آئے؟

کراچی یونی ورسٹی میں اب افراد کے مطالعے کی حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے۔ میرے نزدیک مجموعی طور پر یہ رویہ درست ہے لیکن بہر حال ہر دَور میں ایسے ادیب موجود ہیں جن پر تنقیدی یا تحقیقی ویسا کام نہیں ہوا جیسا ہونا چاہئے۔ مثلاً قائم پر یا مصحفی پر یا آتش پر، اتنی کتابوں کی موجودگی کے باوجود وہ کام نہیں ہوا جو ہونا چاہئے۔ تو یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ادوار کا مطالعہ ہونا چاہئے کہ مختلف ادوار میں صفِ اوّل اور صف دوم کے ادیبوں کی خصوصیات کیا ہیں جن سے وہ دَور سمجھ میں آئے۔ مثلاً آپ ہی سے میں میر ناصر علی پر جو کام کرا رہا ہوں اس کا جو خاکہ پہلے میرے یا آپ کے ذہن میں تھا اب وہ کام پہلے سے مختلف ہے۔ وہ میر ناصر علی کا بھی مطالعہ ہے۔ اُردو انشائیے کا بھی مطالعہ ہے۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید بھی اس میں ہے اور تحریکوں کا مطالعہ بھی ہے۔ ہمارے جو مقالے لکھے جا رہے ہیں تو ان میں قدر و قیمت کا تعین نہیں ملتا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کی طرف توجہ دینی چاہئے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب یہ تو ایک بڑی تشویش ناک صورت حال ہے جس کا اظہار آپ نے فرمایا اور اس میں ہمارے لیے ایک انتباہ بھی ہے اس کو کیسے بدلا جا سکتا ہے؟

جواب: ابھی جو آپ نے کہا کہ صورتِ حال بھیانک ہے تو پس چہ باید کرد۔ اس کو بدلنے کے لیے اب تک جو باتیں ہوئیں ان میں بھی اس کا جواب مضمر ہے۔ لڑکے میں کوئی ادبی ذوق نہیں ہوتا۔ معلومات بوجھ کی طرح جمع کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایم اے کی سطح پر اس کا اہتمام کیا جائے کہ بڑے ادیبوں یا رجحانات کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے انہیں آگاہ کر دیا جائے کیوں کہ تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ کس موضوع پر تحقیق ہو۔ طلباء کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کسی ایسے آدمی کا داخلہ ہی نہیں ہونا چاہئے جو خود موضوع کا تعین

نہ کرے۔ آپ کے زمانے میں تو نہ تھا، مگر اب کچھ اختیاری کورس ہیں ایم اے کی سطح پر۔ ان کورسز سے یہ فائدہ ہے کہ طالب علموں کی تعداد کورسوں میں کم ہو جاتی ہے اور استاد اچھے طلباء کو آسانی سے پہچان سکتا ہے۔ ٹیوٹوریل کا اچھا انتظام ہو۔ ٹیوٹوریل کا مغربی جامعات میں اور ہماری جامعات میں بھی یہی تصور تھا کہ کسی کتاب پر یا مضمون پر طالب علم تنقیدی مقالہ لکھتا ہے۔ پھر اس پر استاد اور طلباء کے درمیان بحث ہوتی تھی۔ آج کے طالب علم کو ٹیوٹوریل کا صحیح اندازہ نہیں۔ اگر ٹیوٹوریل کا وہ طریقہ مروّج ہو جائے جو یونی ورسٹی میں ہونا چاہیے تو طالب علم کے مزاج کا اندازہ ہو جائے گا۔

دوسری بات میرے خیال میں ایم فل کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ اسے ایک سال یا ڈیڑھ سال میں مکمل کر لیا جائے۔ طالب علم کو موقع دیا جائے کہ ایم فل کو زیادہ سے زیادہ دو سال تک کر لے۔ ایم فل میں کچھ کورسز ہوں جیسے منہاجیاتِ تحقیق، لائبریری کا استعمال، مخطوطہ شناسی، اشاریہ سازی، کتابیات، تھوڑی سی منطق اور تنقیدی فکر (CRITICAL THINKING) کو ایک مضمون کی طرح پڑھایا جا سکتا ہے۔ انہی کورسز کے ساتھ ساتھ ایک متعلقہ زبان کی باضابطہ تعلیم اس سطح پر ہو کہ آدمی اسے علمی مقاصد کے لیے استعمال کر سکے۔ مثلاً اُردو تحقیق کے سلسلے میں بسا اوقات عربی و فارسی یا ہندی میں سے کسی ایک زبان کا ایسا علم ضروری ہوتا ہے۔ ممکن ہے علاقائی زبان کی تعلیم کی ضرورت ہو جیسے پنجابی یا سندھی اور اُردو صوفیانہ شاعری کے مشترک عناصر اور اسالیب پر کام ہو سکتا ہے۔ ایم فل میں طالب علم کے لیے ایک مختصر مقالہ لکھنا لازم ہو اور ایم فل کرنے کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ دیا جائے۔ ایم فل کے مقالے کی توسیع کی جگہ نئے موضوع پر کام کرنا لازم ہو۔

یہ وہ تدابیر ہیں جن سے میرے خیال میں صورت حال بدل سکتی ہے۔

ادیبوں کے مسائل

گزشتہ سال ہماری جامعہ میں بیروت کے ایک ادارے کا خط آیا کہ ہم عالمِ اسلام کے ان تحقیقی اور تعلیمی اداروں کے بارے میں معلومات جمع کر رہے ہیں جہاں السنۂ شرقیہ پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ اور میں سوچنے لگا کہ یہ اپنے اور انسانی مستقبل پر اعتماد کی کیسی خوب صورت مثال ہے کہ جس شہر کی صبح کے آئینے میں شام کے خدوخال نظر نہیں آتے اور جہاں رات، صبح کی خبر نہیں دیتی وہاں ایک ادارہ ایسے کام میں مصروف ہے۔ اور پھر مجھے برسوں پہلے کی پڑھی ہوئی یہ بات یاد آئی کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران جب فرصت کا کوئی لمحہ میسر ہوتا تو میدانِ جنگ کی خندقوں میں برطانوی سپاہی شیکسپیئر کا مطالعہ کرتے۔

حیدرآباد اور کراچی کے واقعات اور ملک کے دوسرے حصّوں میں بموں کے دھماکوں کی آوازوں کے سائے میں آج ہم ''قلم قبیلہ'' کی اس محفل میں آج کے ادب کے مسائل پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ یہ بات بھی ان دونوں مثالوں سے رشتہ اور نسبت رکھتی ہے جو میں نے ابھی پیش کیں۔ ہمیں یہ عزم، یہ حوصلہ اور مستقبل سے یہ وابستگی مبارک ہو۔ اگر ہم اپنے آپ سے اور اپنے معاشرے سے مایوس ہوتے تو ہمارا عمل حافظ شیراز کے لفظوں میں یہ ہوتا کہ

مۓ دو سالہ و محبوب چہاردہ سالہ
ہمیں بس ست مرا صحبت صغیر و کبیر

لیکن ہم نے حافظ کی اس ہدایت کو اپنایا ہے۔

ہاں مشو نومید چوں واقف نۂ از سرِ غیب
باشد اندر پردۂ بازیہائے پنہاں، غم مخور

ہم آج کے ادب کے مسائل پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ سوال بھی کسی آدمی سے کیا جاتا ہے چاہے مسئلہ کا تعلق اجتماع سے ہو۔ جس مسئلہ یا سوال کو ہم ذاتی کہتے ہیں وہ بھی ذاتی کب

ہوتے ہیں۔ ادب، تہذیب اور ثقافت سے تعلق رکھنے والے اتنے اصحاب کا اجتماع یقیناً اپنے دامن میں بڑی معنویت رکھتا ہے۔ آج جہاں کلاشن کوف کی آوازیں فضاؤں میں گونج رہی ہوں وہاں ہم اپنے لکھے ہوئے الفاظ کے مسائل پر فکر کرنے کے لیے یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ ویسے آج کے موضوع کے حدود کا تعین میرے لیے مشکل ہے۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا رہا ہوں کہ ادب کے مسائل یا ادیب کے مسائل......اور کیا ان دونوں کے درمیان کوئی خط کھینچا جاتا ہے......

میرا خیال ہے "نہیں"۔

ادب کے مسائل کیا ہیں؟ ادب میں اظہار کا مسئلہ، موضوعات کا انتخاب۔ اور ادیب کے مسائل، شاید انہیں شمار بھی نہ کیا جا سکے۔ اکادمی ادبیات پاکستان جب ادیبوں کا اجتماع برپا کرتی ہے تو کیسے کیسے مسائل پیش کیے جاتے ہیں۔ کتابوں کی طباعت سے لے کر کنوارے یا دوسری شادی کا ارادہ رکھنے والے ادیبوں کے لیے شادی کے قرضے تک۔

خواتین و حضرات! آج ان سب مسائل سے پہلے ایک اور مسئلہ اپنے ہزار پہلوؤں کے ساتھ ہمارے سامنے آ رہا ہے اور وہ ہے بقائے انسانی کا مسئلہ۔ پھر انسان کی زندگی کا انحصار صرف روٹی، کپڑے اور مکان تک محدود نہیں۔ ان چیزوں کا تعلق اس سطح سے ہے جس پر انسان دوسرے تمام حیوانوں کے ساتھ سانس لیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم روٹی کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہم صرف روٹی کے سہارے اور ذریعے زندہ نہیں رہ سکتے۔ روٹی اور جسم کی بقا کے مسائل کے بعد، اقدار اور روح کے مسائل آتے ہیں۔ مذہب اور ادب و فلسفہ کا رشتہ اسی بلند تر سطح کے مسائل سے ہے۔

ان مسائل سے اُلجھنے، ان سے عہدہ برآ ہونے اور انہیں سُلجھانے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ میں تحفظ ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہم کسی گلی سے گزرتے ہوئے ڈریں کہ نہ جانے کس بند دروازے کے پیچھے سے کوئی ہاتھ نکلے گا اور اس ہاتھ کا خنجر ہماری پشت کو اپنا ہدف بنائے گا۔ پچھلے دنوں کراچی میں مغرب کے بعد ایک قدرے سنسان علاقے سے گزرتے ہوئے تیزی سے اپنی طرف آتی ہوئی ہر گاڑی سے مجھے خوف محسوس ہوا اور اسی لمحہ میں نے یہ سوچا کہ دوسرے بھی ہم سے اسی طرح خوف

زدہ ہوں گے۔ عدم اعتماد کی یہ فضا تہذیب و ثقافت اور شرفِ انسانی دونوں کے لیے کیسی مضر ہے۔ اس عارضی کیفیت سے قطع نظر میرے ایک دوست عارف جلالی کی یہ بات بھی میرے ذہن میں گونجتی رہتی ہے۔

وہاں خاک عہدِ وفا نبھے، وہاں خاک دل کا کنول کھلے
جہاں زندگی کی ضرورتوں کا بھی حسرتوں میں شمار ہے

نثری اسلوب نے اس شعر اور خیال کی کاٹ پر دھار رکھ دی ہے۔ میں اس مسئلہ کو ادب اور ادیب کے باب میں اُم المسائل سمجھتا ہوں۔ تحفظ کے ساتھ ساتھ تعلیم انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور خواندگی و تعلیم ہی ادب کی دُنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے۔

ہم ایک نیم خواندہ بلکہ ناخواندہ معاشرے میں زندہ ہیں۔ خواندگی کی شرح سترہ، اٹھارہ فیصد بتائی جاتی ہے اور اس شرح میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو صرف دستخط کر سکتے ہیں۔ ابتدائی خواندگی کے بعد حرف اور کاغذ سے ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ادب اور خاص طور پر سنجیدہ ادب کا قاری جنسِ نایاب ہے اور مقبول ادیبوں کے سوا ہمارا ہر ادیب یقیناً اپنے آپ سے یہ سوال ضرور کرتا ہوگا کہ ہم کس کے لیے لکھیں؟

خیر یہ سوال اپنی جگہ سہی، مگر لکھنا اس کی مجبوری ہے۔ ادب یقیناً ایک سماجی عمل ہے۔ ادیب اپنے پڑھنے والوں کے لیے لکھتا ہے مگر وہ اپنے لیے بھی لکھتا ہے۔ کھلنا کلی کا مقدر ہے اور لکھنا ادیب کا۔ لیکن جب اس کی کتاب کی اشاعت کے وسائل نہیں ہوں گے تو وہ احتجاج کے لہجہ میں سوال ضرور کرے گا کہ کس کے لیے لکھیں؟

اس سوال سے یاد آیا کہ بعض سرکاری اداروں کی طرف سے بڑی تعداد میں کتابوں کی خریداری کے اشتہار شائع ہوتے ہیں یا مسودے کی اشاعت کے لیے منظوری کے اشتہارات۔ مگر یہ تفصیلات بھی آپ نے پڑھی ہوں گی کہ شاعری، افسانے، ناول، سفرنامے اور حوالہ کی کتابیں پیش نہ کی جائیں۔

ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے

اور پھر ڈاکٹر سہیل بخاری جیسے محقق کے پاس ایسے ہی کسی ادارے سے کسی دن ڈاکیا خط لے کر آتا ہے کہ آپ کا مسودہ ہمارے معیار کے مطابق نہیں۔ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ ہم لکھنے والے سچ مچ ایک قبیلہ بن جائیں اور اپنے مسائل خود حل کریں۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں اُردو اور دوسری زبانوں کے خوشحال ادیبوں کی تعداد اتنی ضرور ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی اچھی کتابیں اگر خرید کر پڑھا کریں تو کتابوں کے پھیلاؤ کا مسئلہ بیس فیصد حل ہو سکتا ہے مگر کتاب ہمارے لیے اتنی اہم نہیں رہی۔

اس مسئلہ کا تعلق اہلِ قلم کے گروپوں، لابیوں اور تعصّبات سے ہے۔ پنجاب کے دو ادبی گروہوں میں ایسے اچھے لکھنے والے موجود ہیں کہ ہم ان کی گروہ بندی کو فراموش کرنے اور ان کو پڑھنے پر مجبور ہیں مگر ان گروہوں کے رسالوں اور ان کے لکھنے والوں کی کتابوں میں ایک دوسرے پر حملے ہمیں تو آزردہ کرتے ہی ہیں، عام پڑھنے والوں کو وحشت زدہ اور اتنا مایوس کرتے ہیں کہ وہ ادب کو ایک اوپری اور بیکار چیز سمجھنے لگتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ جو ادب اپنے لکھنے والے کے دل کی دنیا نہ بدل سکے اس کا حاصل کیا ہے؟ ادب تو اس حسن، شرافت اور شرف کا اشاریہ اور علامت ہے جو انسان کے وجود کا جواز ہے۔ پھر اسے کردار اور عمل سے الگ کرنا کیا اتنا ہی آسان ہے۔

میں مسائل کے سراغ لگانے کی اس کوشش کو کسی تنقیدی مقالے میں تبدیل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، مگر یہ بات ضرور ذہن میں آ رہی ہے کہ کہیں اسی صورت حال کی وجہ سے تو آج ہمارا ادب ان اقدار سے محروم نہیں ہو گیا جو ادب کو آفاقیت عطا کرتی ہیں اور شاید ادب آج زندگی اور اس کے احوال و کوائف کی تفہیم کے سلسلہ میں اپنے قاری کی مدد نہیں کر رہا ہے۔ میں نے اس صدی کے ایک بڑے ذہن Gasset سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وجودی فلسفطی گیسے کے خیال کے مطابق معاشرے کی وحدت دو عناصر سے وجود میں آتی ہے۔ اقلیت اور ہجوم۔ اہلِ فکر، اہلِ دانش اقلیت ہیں اور ہجوم کو اقدار سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ Hyperdemocracy اسی ہجوم کی ہیئت اجتماعیہ کا نام ہے جس میں ہجوم قانون کے دائرے سے باہر نکل کر راست اقدام کرتا ہے۔ گیسے نے کہا ہے کہ ''ہجوم اپنے بوجھ اور قوت سے ہر اُس چیز کو کچل دیتا ہے جو مختلف ہوتی ہے۔ کوئی شخص جو ہجوم

والوں کی طرح نہ ہو ہٹائے جانے کے خطرے میں مبتلا رہتا ہے۔ یوں دہشت کا عنصر ہمارے عہد کی تقدیر بن گیا ہے۔

اہلِ قلم اور اہلِ فکر ہی اس ہجوم کو مختلف اسالیب سے اور مختلف طریقوں سے باشعور عوام بنا سکتے ہیں۔ ایسے عوام جو قدروں کے بارے میں بحث تو نہ کر سکتے ہوں مگر انہیں یہ اقدار جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جن لوگوں نے آزاد وطن کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کیا وہ ایسے ہی عوام تھے جو اسلامی تاریخ کے ناموں، کارناموں اور واقعات کو نہیں جانتے تھے مگر اسلامی تاریخ کی رُوح نے ان کے وجود میں اپنا مسکن بنایا تھا۔ یہ وہ قلندر تھے جو صرف دو حرف ''لا الہ'' کے وارث تھے اور جنہوں نے فقیہ شہر کی طرح گوشۂ عافیت تلاش نہ کیا۔ اسی طرح ستمبر ۶۵ء میں اس قوم نے اپنے آپ کو ایک بار پھر پالیا۔ بازیافت کا عمل محض اتفاق نہیں ہوتا۔ اس میں کتنے ہی عناصر کارفرما ہوتے ہیں اور ان عناصر میں ادب بھی ہے۔ سرسیدؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور اقبالؔ نے ہمیں اپنے ماضی کی روایات ہی باخبر نہیں کیا بلکہ مستقبل کے خواب بھی دیئے اور ہمیں ضمیر وجود میں چھپے ہوئے عملی امکانات کی نوید بھی دی۔

میں نے جو کچھ عرض کیا اس کا تعلق صرف ادب کی قومی اور فکری اہمیت سے نہیں بلکہ ادیب اور ادب کی ایک ضرورت اور مسئلہ سے ہے۔ یہ مسئلہ امن اور سکون کی فضا کے قیام کا ہے۔ بقول گیسے

''تہذیب اجتماعی زندگی بسر کرنے کی خواہش کا نام ہے۔ وہ جو دوسروں کے متعلق نہ سوچے وحشی ہے۔ ہمارا کام اور مسئلہ دوسروں کے بار۔۔ے میں سوچنا ہی ہے''

کیا تجھ کو پتا، کیا تجھ کو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکُلِ گیتی ہم تجھ کو کس طرح سنوارا کرتے ہیں

اس مرحلے پر اب یہ بات کہے بنا چارا نہیں کہ بے انصافیوں سے وحشت اور بربریت کو ایک منطق مل جاتی ہے۔ ہجوم ہتھیار ہاتھ میں لے کر جب فساد برپا کرتا ہے تو اسے حصولِ انصاف کی کوشش کا نام دیا جاتا ہے اور اس ہجوم کو ایسے نام نہاد دانشور، اہلِ قلم، فلم ساز، ڈرامہ نویس مل جاتے ہیں جو اس ظلم کو Glorify کرتے ہیں۔ یہ موضوع بھی آج کے ادب کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ہمیں ایک

طرف تو ظلم کے سرچشموں کے خلاف جہاد کرنا ہے اور دوسری طرف عوام کو یقین دلانا ہے کہ کوئی اجتماعی مہم بندوق کی گولی اور نعرۂ جنگ سے زیادہ موثر ہو سکتی ہے۔ یہ محض نظری بات یا وعظ نہیں۔ پاکستان کا قیام اس صداقت کی توثیق کرتا ہے۔ ہمارا ادیب رشوت، ظلم، بے ایمانی کے خلاف لکھے، ان اداروں کے خلاف لکھے جو ان برائیوں میں مبتلا ہیں، پھر عوامی وسائل ابلاغ کے ادارے انہیں پیش کریں تا کہ انہیں سرکاری کی جگہ سچ مچ عوامی کہا جا سکے اور ہم آپ نکڑ ناٹک کی ٹولیاں بنائیں۔ شہروں اور بستیوں کے چوکوں اور نکڑوں میں ایسے ناٹک پیش کریں جن کے لیے اسٹیج کی ضرورت نہ پڑے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ادیبوں کو لاتعلقی اور خلوت گزینی سے نکل کر اجتماعی زندگی کے دھارے میں فکری اور عملی طور پر شریک ہونا ہے کیوں کہ لاتعلقی مایوسی کا پہلا مرحلہ ہے۔ کراچی اور حیدرآباد میں جو کچھ ہوا اس پر سیاست دانوں نے اپنے ردِعمل کا اظہار کیا اور خوب خوب اور یوں کہ اس طریق کار کو لاشوں کے بیوپار اور لاشوں پر سیاست کی بساط جمانے کے سوا کیا کہا جائے مگر کیا ادیبوں نے اپنے ضمیر اور فکر کے موثر اور اجتماعی اظہار کی کوئی کوشش کی؟ میں اپنے آپ کو اپنے ضمیر کی عدالت میں شرمندہ اور سرافگندہ کھڑا دیکھتا ہوں۔

آج کے لسانی جھگڑوں میں بدنصیبی سے بہت سے ادیب اور دانشور بھی کسی نہ کسی عنوان شامل ہیں۔ ان سے یہ عرض کروں گا کہ زبان کا اختلاف تو قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ زبانیں انسانوں کو ملاتی ہیں، تقسیم نہیں کرتیں اور فکری ہم آہنگی مختلف زبانوں کے دل کو ایک طرح دھڑکنا سکھاتی ہے۔ اس کا ایک عملی تجربہ یوں کیجئے کہ کیا نعت سنتے ہوئے اُردو، پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو وغیرہ میں سے کوئی زبان آپ کو غیر اور اجنبی معلوم ہوتی ہے؟ نہیں، کیوں کہ وحدتِ عالم کے امین اور رسولؐ کا ذکر انہیں ایک وحدت بنا دیتا ہے۔ اسی طرح آپ کا تعمیری جذبہ، لفظوں میں ڈھل کر کسی بھی زبان میں اجنبی نہیں رہ سکتا۔

ہمیں ایسی انجمنوں اور اداروں کی ضرورت ہے جن میں سبھی پاکستانی زبانوں کے ادیب جمع ہو سکیں۔ اور سال میں ایک، دو بار نہیں بلکہ وہ اپنی بہت سی شامیں ایک دوسرے کے ساتھ گزار سکیں۔ آج میں نے قلم قبیلہ کا یہ عمارتی سلسلہ (Complex) پہلی بار دیکھا۔ ادیبوں کے لیے رہائشی

کمرے، سماعت گاہیں وغیرہ، اور مجھے احساس ہوا کہ یہ میری چیز ہے حالانکہ مجھے شرمندگی کے ساتھ اعتراف ہے کہ اس میں ایک اینٹ لگانے میں بھی میرا عملی حصہ نہیں۔

محترمہ ثاقبہ رحیم الدین کے چندروزہ قیام کراچی کے زمانے میں ایک شام اس مسئلہ پر ان سے ادیبوں نے کچھ گفتگو کی اور ہمیں اس شام یاد آیا کہ جب کراچی میں کافی ہاؤس تھا تو ادیبوں کے تعلقات اور رویے میں اتنی منافقت نہیں تھی اور چونکہ بزرگ ادیب بھی آتے تھے تو ملنے کے طریقے بھی آداب اور احترام رکھتے تھے۔ اب گفتگو بھی جھگڑا معلوم ہوتی ہے۔ لاہور میں پاک ٹی ہاؤس کا کردار اس سلسلہ میں مطالعے کا مستحق ہے۔ پاکستان کے مختلف شہروں کے ادیبوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ قلم قبیلہ کی شاخیں شہروں اور بستیوں میں قائم ہوں۔ چھوٹی سی عمارت، جیسے بہت سے پریس کلب ہیں، ہماری ضرورتوں کو کسی حد تک پورا کرسکتی ہے۔ ایک کُتب خانے کا کمرہ اور ایک چائے نوشی کا کمرہ۔ اور ہمیں یہ کام حکومت سے امداد مانگے بغیر کرنا ہے کیوں کہ جب ہم کچھ لیتے ہیں تو کچھ دیتے بھی ہیں اور اب ہم کچھ دینے کے لیے تیار نہیں۔

ہمیں ایسے قہوہ خانوں اور ادبی مرکزوں کے علاوہ ایک اور Forum کی ضرورت ہے اور وہ ہے ادبی ماہنامے کا فورم۔ آج پاکستان میں اُردو کے صرف تین، چار ادبی ماہنامے شائع ہورہے ہیں افکار، دائرے، تخلیق اور ماہ نو۔ ماہ نو کی اپنی پابندیاں ہیں اور وہ ہمارے لیے فورم اور بحث کا ادارہ نہیں بن سکتا۔ افکار نے بھی اس بات کی اہمیت نہیں سمجھی، اور دائرے کے صنعت کار مالکوں کو بھی شاید ادبی اور فکری اختلافات اور اظہارِ خیال کی اہمیت کا قائل بنانے میں اس کے مدیر اب تک کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ میں قلم قبیلہ کی صدر نشین سے درخواست کروں گا کہ وہ ایسا ماہنامہ نکالیں جس میں ادبی مباحث پر شخصی حملوں اور شدتِ تعصب کے بغیر مسلسل بحث کی جاسکے۔ بحث میں اختلاف کے پہلو بھی آتے ہیں، اتفاق کے بھی، اور اہم تر بات یہ ہے کہ کئی لوگ مل کر کسی صداقت کی پیش کش اور بیان کی تکمیل کرتے ہیں۔

میں نے اپنی توجہ ادیبوں کے عملی مسائل پر رکھی ہے۔ آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ ادب بھی

ادیبوں کا مسئلہ ہے اور سب سے بڑا مسئلہ۔ کبھی ترقی پسند ادب اور حلقۂ ارباب ذوق والے اپنے اپنے نقطۂ نظر کا پرچار کر رہے تھے اور دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ سیکھا' اپنے آپ میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ میراجی نے "اس نظم میں" کے دیباچے میں ادب پر سماج کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ انسانی زندگی سال بہ سال بدلتی ہے۔ اور ترقی پسندوں نے فرد کو سمجھنا سیکھا...... لیکن آج ادب میں چوپائی چل رہی ہے جو بڑھتی ہے تو جھکڑ میں بدل جاتی ہے...... فکر و اسلوب میں انتشار ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ ابہام زبان اور بیان کا ایک جز ہے جس سے نجات ممکن نہیں، مگر ادیب ابہام کے گنبد میں در پیدا کرتا ہے اور ابہام کے بطون سے معنی کا شگوفہ لے کر آتا ہے۔ اس کی غواصی انسان کا شرف ہے لیکن آج کا ادیب اس بات پر فخر کرتا ہے کہ ہماری "لایعنیت" زندگی کی "لایعنیت" اور "بے معنویت" کا عکس ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب زندگی کی جہتیں بے جہت ہونے لگیں اور منظر دُھندلا جائیں تو یہ ادیب کا کام ہے کہ وہ جہتوں کا تعین کرے اور ادب کے آئینے میں منظروں کو اُبھارے اور روشن کرے۔ ہمیں آج زندگی اور ادب دونوں کو جہت اور معانی دینے ہیں کہ یہی ادیب کا کام ہے اور اس کا منصب ہے۔ اور اب

یار زندہ، صحبت باقی، ہم زندہ، مسائل باقی

مسائل مُردوں کے نہیں ہوتے، زِندوں کے ہوتے ہیں۔

(قلم قبیلہ کے ایک اجلاس منعقدہ ۱۹۸۶ء میں پڑھا گیا)

رابطہ کی سفیراور ہم

بیسویں صدی کے ہندو پاک ادب نمبر ۱۹۸۹ء کی مناسبت اور اہمیت کے پیش نظر خیال آیا کہ عظیم جنوبی ایشیا کے ان دونوں میں ادیبوں' اداروں اور خادموں کو چند اہم کاموں کی طرف متوجہ کیا جائے' یہ ایسے کام ہیں جن کا کبھی نہ کبھی کسی گوشہ سے ذکر کیا جاتا رہا ہے' لیکن اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ کام ایک تحریک کے طور پر کئے جائیں۔ ان میں سے بعض کام ایسے ہیں جو افراد کے کرنے کے نہیں' بلکہ ادارو کے کرنے کے ہیں۔

لیجئے' اداروں کے لفظ سے پہلے کام کا خیال ذہن میں ابھرا۔ پاکستان اور ہندوستان میں اردو کے بہت سے ادارے علمی وادبی کام کررہے ہیں' ان اداروں میں اکثریت سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی ہے۔ غیر سرکاری ادارے بھی موجود ہیں' ایسے ادارے بھی جو کسی ایک فرد کی ذات اور شخصیت سے وابستہ ہیں۔ ترقی اردو بیورو ہند' مقتدرۃ قومی زبان پاکستان' انجمن ترقی اردو پاکستان' انجمن ترقی اردو ہند' اردو ڈکشنری بورڈ پاکستان' ہندوستان کے کئی صوبوں کی اردو اکیڈمیاں' مجلس ترقی' ادب پاکستان' دارالمصنفین ہندوغیرہ۔ میرا مقصد فہرست سازی نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مکتبۂ جامعہ اور فیروز سنز جیسے ناشرین کو بھی ادارے کہنا مناسب ہے۔ یہ سب ادارے اچھا کام کررہے ہیں۔ بعض کا دائرہ کار متعین ہے۔ مثلاً اردو ڈکشنری بورڈ' لیکن دوسرے اداروں کے کاموں میں تکرار ملتی ہے۔ ضروری ہے کہ یہ ادارے ایک دوسرے سے تعاون کریں' ان کے مقاصد اور دائرہ کار کا متعین ہوجائے اور یہ ادارے اپنا ایک وفاق قائم کرلیں۔ کم سے کم یہ بات تو بہت آسانی سے ممکن ہے کہ ہندوستان کے علمی وادبی ادارے اپنا وفاق بنالیں اور پاکستان کے ادارے اپنا وفاق۔ پھر ان دونوں وفاقوں کے درمیان مشاورت معلومات کا تبادلہ آسان تر ہوگا۔ ان اداروں کے درمیان تعین کار کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ یہ ایک مزے کی ذہنی مشق ہوسکتی ہے۔ اس پر آپ بھی اظہار خیال

کر سکتے ہیں اور میں بھی، لیکن مناسب تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ یہ ادارے خود کرلیں۔ بہت سے ادارے اپنے کام کے سلسلے میں رکاوٹیں محسوس کر کے ادھر ادھر کے کام کرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر مقتدرۂ قومی زبان کے ذمہ نفاذ اردو کا فریضہ سپرد کیا گیا تھا لیکن مقتدرہ نے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا اور چھوٹے چھوٹے کتابچوں اور متوسط درجہ کی کتابوں کی اشاعت شروع کردی۔ اس صورت حال کی پوری ذمے داری مقتدرہ پر نہیں مگر مقتدرہ والوں نے حالات سے صلح کرلی اور اپنے مناصب کی برقراری کو ہی سب کچھ سمجھ لیا۔

ایک ہی کام کے لئے سرکاری سطح پر ایک سے زیادہ ادارے بھی موجود ہیں۔ مثلاً پاکستان میں اقبال۔ اکادمی اور بزم اقبال، یہ وسائل کا ضیاع ہے۔ مقصد؟ خیر چھوڑیئے، اقبال اکادمی جس سلیقہ سے اپنا کام کررہی ہے، اس کے پیش نظر یہی ادارہ اقبالیات کے فروغ کے لئے کافی ہے اور بزم اقبال کے ڈائریکٹر کے لئے اقبال اکادمی کے شعبہ تحقیق میں اسکالر کی اسامی نکالی جاسکتی ہے۔

میری رائے میں بعض علمی وادبی رسالوں کو بھی ادارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ادبی ماضی میں ایسے کتنے ہی ادارے نظر آتے ہیں۔ ''نگار'' لکھنو کو آزادی فکر ونظر ''معارف'' کو علمی تحقیقات ''ساقی'' کو جدید افسانے کے فروغ کے ادارے کہنا مناسب ہوگا۔ میں نے پھر چند مثالیں ہی پیش کی ہیں۔ ویسے مخزن، ہمایوں، زمانہ، ادیب اور ایسے ہی دوسرے رسالے بھی اس زمرہ میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ آج نقوش کو یہی مرتبہ حاصل ہے۔ نقوش کے خاص نمبر علمی وادبی خدمات کے اہم سنگِ میل ہیں۔

یہ رسالے ادبی فضا کی تخلیق کے نقطہ نظر سے بھی ادارے تھے۔ آج اردو میں ادبی ماہنامے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سرکاری پرچوں سے قطع نظر پاکستان میں صرف ایک ادبی ماہنامہ ''افکار'' شائع ہوتا رہا ہے۔ اب ماہنامہ دائرے کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ (۱) ہندوستان میں

---

(۱) افسوس یہ دو ماہنامے بھی مرحوم ہو چکے ہیں، ہاں ''ادب لطیف'' اور ''تخلیقِ خاص'' پابندی سے شائع ہورہے ہیں۔

بھی صورتِ حال کچھ ایسی اطمینان بخش نہیں۔ ماہنامہ ''شاعر'' ہی ہر مہینے چھپتا رہا ہے۔ اب ''کتاب نما'' بھی ایک ادبی ماہنامہ کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ ''الفاظ'' ہر ماہ نہیں شائع ہوتا۔ ادبی ماہناموں کے فقدان کی وجہ سے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے درمیان رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ آزادی سے کچھ پہلے تک ''ساقی' زمانہ' ادب لطیف' ہمایوں' نگار اور ادبی دنیا'' وغیرہ زندہ اداروں اور تحریکوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان پرچوں میں کوئی اچھی تحریر شائع ہو جاتی تو اس کا اثر پشاور سے حیدرآباد اور دکن تک محسوس کیا جاتا تھا۔ اچھی تحریروں پر گفتگو ہوتی اور ان ماہناموں کے صفحات پر عام پڑھنے والے اپنی آرا کے ذریعے بڑے سے بڑے لکھنے والے کی راہنمائی کرتے۔ ضروری ہے کہ اُس دور کو ایک بار پھر زندہ حقیقت بنایا جائے۔

ان دنوں ہندوستان میں ''شمع' اور بیسوی صدی'' اور پاکستان میں کئی ڈائجسٹ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ شمع' اور بیسویں صدی'' کو نیم ادبی رسالے کہا جاتا ہے اور اگر یہ بات تحقیر سے نہ کہی جائے تو کچھ ایسی غلط نہیں کیونکہ ان پرچوں میں تنقید' تحقیق اور کئی ادبی اصناف کی گنجائش کم ہی رہی ہے۔ اب ان پرچوں کا دائرہ مضامین وسیع تر ہو رہا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے ادبی پنڈتوں نے ڈائجسٹ کے لفظ کو ایک گالی بنا دیا ہے' حالانکہ ان ڈائجسٹوں میں انگریزی کے جدید افسانوی ادب کے بہترین نمونے شائع ہو رہے ہیں۔ انہیں ڈائجسٹوں نے کرشن چندر جیسے مقبول افسانہ نگار اور ابوالفضل جیسے مشکل افسانہ نگار اور طویل کہانیاں لکھنے والوں کی نگارشات کو لاکھوں پڑھنے والوں تک پہنچایا۔ ایک ڈائجسٹ ہی کے لئے شوکت صدیقی کا ناول ''جانگلوس'' لکھا گیا۔ کئی اور معتبر افسانہ نگاروں نے ان ڈائجسٹوں کے لئے لکھا ہے اور کبھی کبھی نام بدل کر۔ اے حمید بھی ایک ڈائجسٹ کے لئے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان ڈائجسٹوں کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اردو کے جدید افسانہ نگاروں کے ہاں کہانی نہیں ملتی اور عام پڑھنے والوں نے ان کے افسانوں کو رد کر دیا ہے۔ شاید اسی رویہ کی وجہ سے اب ہمارے افسانہ میں کہانی پھر سے جگہ پا رہی ہے۔ میری رائے میں نیم ادبی پرچے اور ڈائجسٹ ایسے مرحلہ میں داخل ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے قارئین

کے حلقہ کو محدود کیے بغیر اپنے ادبی رنگ کو نمایاں تر کر سکتے ہیں۔ میں پاکستان سے شائع ہونے والے خوبصورت رسالوں کو رسالوں کا الگ زمرہ قرار دیتا ہوں۔ کسٹم کی الجھنوں سے بچنے کے لئے یہ رسالے ہانگ کانگ یا سنگاپور کے پریسوں میں چھپتے ہیں اور وہاں سے مختلف ممالک بھیجے جاتے ہیں۔ رسالوں کے اس زمرہ کا آغاز ''رابطہ'' سے ہوا اور اب کئی اور رسالے اس نوع کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ انہیں عائلی رسالے یعنی فیملی میگزین کہیے۔ یہ ملاقاتی کمروں کی زینت بھی بنتے ہیں اور ان میں شائع ہونے والی شاعری اور افسانے معیاری ہوتے ہیں۔

ان رسالوں نے رابطہ کی سفیر یعنی اردو زبان کے ادب کو دور دور تک پہنچا دیا ہے۔ اردو اب برعظیم جنوبی ایشیا کے تینوں ملکوں کے علاوہ سعودی عرب' عرب امارات اور انگلستان کے بڑے علاقوں میں پڑھی اور بولی جانے والی زبان ہے۔ اردو کے اخبارات و رسائل کنیڈا' انگلستان' آسٹریلیا' امریکہ' چین اور کئی ممالک سے شائع ہو رہے ہیں۔ یہ وہ اخبار و رسائل ہیں جو اِن ممالک کے اردو حلقے شائع کر رہے ہیں۔ میں مختلف ملکوں کے سرکاری پروپیگنڈا رسائل کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ ضرورت ہے کہ یہ رسالے کسٹمز اور جغرافیائی سرحدوں کو عبور کر کے اردو دنیا کے ہر گوشے تک پہنچ سکیں۔

اس مسئلہ کا ایک حل ''انتخابی رسالے'' ہو سکتے ہیں۔ کراچی سے نقش اور جائزہ یہ دو رسالے طویل مدت تک ادبی رسالوں کے مضامین کا انتخاب شائع کرتے رہے۔ اب ایسا کوئی رسالہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ایک رسالہ پاکستان سے اور دوسرا ہندوستان سے شائع ہونے لگے تو اردو کے ادیب اور پڑھنے والے ایک دوسرے سے قریب آ سکیں گے۔ اس کی افادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اردو کے قارئین کی قوت فروخت محدود ہے۔ ایسے کسی ایک رسالے کے مطالعے سے وہ بہترین نئی تخلیقات سے واقف رہیں گے۔ ''بیسویں صدی'' کا ادارہ ایک ایسا ادبی رسالہ شائع کر سکتا ہے جس میں پاکستان' بنگلہ دیش اور دوسرے ممالک کے رسالوں کے انتخاب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی بھی چند تخلیقات شامل ہوں' اسی طرح

نئے افق پبلی کیشنز گروپ یا کوئی اورادارہ پاکستان سے ایسا ادبی انتخابی پرچہ شائع کرسکتا ہے' جس میں ہندوستان' برطانیہ' عرب امارات سے شائع ہونے والے رسالوں اور مطبوعات کا انتخاب پیش کیا جاسکے۔ایسے دو رسالوں سے اردو کے عالمی ادب کے رجحانات کا اندازہ ہوسکے گا اور دنیا کے مختلف ملکوں میں بسنے والے اردو کلچر کے لوگوں کے مسائل کا بھی مطالعہ کیا جاسکے۔ یہ ایسا کام ہے جس کی صرف ادبی اہمیت نہیں بلکہ عمرانی اور ثقافتی اہمیت بھی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ابلاغ کی جو خلیج COMMUNICATION GAP ہے وہ بڑی سنگین اور کئی اعتبار سے خطرناک ہے۔ دو ملکوں کے باہمی تعلقات اور رشتوں کے مسئلہ کو آسانی اور اطمینان کے ساتھ سیاست دانوں کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے ملکوں میں سیاست دانوں کی فصل تو خوب اگتی ہے مگر سیاسی اور فکری مدبر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کسی کا قول ہے کہ سیاست داں کی نظر اگلے الیکشن پر ہوتی ہے اور سیاسی مدبر کی اگلی نسل پر۔ میرا یقین ہے کہ طویل مدت کے لئے مستقبل سے ادب کا رشتہ سیاست سے زیادہ گہرا ہے۔ جگر مراد آبادی مرحوم نے یہی بات بڑے حسن سے کہی تھی مگر ان کے شعر کے مضمرات' امکانات اور دور اندیشی کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا۔

کام جو ان کا ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اس ابلاغی خلیج کو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کتابوں اور رسالوں کے آزادانہ اور تجارتی تبادلہ کے ذریعے پاٹا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں لکھنے والوں اور شائع کرنے والوں کی ذمے داری یہ ہوگی کہ ایک دوسرے کے اجتماعی جذبات' عقائد اور محسوسات کا احترام کیا جائے۔

ادبی سطح پر اس خلیج کو کم کرنے کی ایک تجویز شعری ادب کی حد تک میرے ذہن میں ہے اور وہ یہ کہ مولانا حسرت موہانی کے انتخاب سخن کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے۔ مولانا کی محبت اور احترام میں میں نے اس سلسلہ کو انتخاب سخن کا سلسلہ کہا ہے۔ اب ذرا وضاحت کردوں۔

انتخاب سخن میں نئے اور زندہ شعرا کا انتخاب ہوگا۔ یہ انتخاب اتنا تفصیلی تو ہو کہ کسی شاعر کے بارے میں انتخاب کی روشنی میں فیصلہ کیا جا سکے۔ انتخاب میں اس کے بہترین کلام کے ساتھ ساتھ کمزور کلام بھی شامل کیا جائے تاکہ ''محاسن' اور معائب'' دونوں کا اندازہ ہو سکے۔ پاکستانی شاعروں کا انتخاب ہندوستان میں کتابی صورت میں اور ہندوستانی شاعروں کا انتخاب پاکستان میں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ یا پہلے کسی رسالے یا رسالوں میں اور پھر کتابی صورت میں۔ ہندوستان کے دو ایک پرچوں میں میں نے بعض پاکستانی شعرا کا انتخاب شائع کرایا تھا مگر یہ کام تسلسل کے ساتھ کرنے کا ہے۔ میں ہندوستان ۸۶۔۸۵ تک پابندی کے ساتھ گیا ہوں اور میں نے جب بھی کسی نئے پاکستانی شاعر کا کلام سنایا تو لوگوں نے حیرت اور مسرت کے ساتھ سنا۔ احمد فراز' منیر نیازی' مصطفیٰ زیدی' ابن انشاء' محسن بھوپالی اور پروین شاکر وغیرہ کے بعد سحر انصاری' عبیداللہ علیم' سلیم کوثر کچھ کچھ جانے جاتے ہیں مگر بہت سے ایسے شاعر جو آج کا وعدہ اور آنے والے کل کی امانت ہیں ہندوستان میں حرف ناشنیدہ کا درد رکھتے ہیں اور جو لوگ معروف بھی ہیں ان کے مرتبہ کا احساس نہیں۔ احمد فراز کو جاننے' پڑھنے اور پسند کرنے والے بہت ہیں لیکن خود ہندوستان کے ادبی حلقوں کو اس کا احساس نہیں کہ فیض کے بعد کے دور شاعری کے اہم ترجمان عزیز حامد مدنی کا جدید اردو شعر کی تاریخ میں کیا مرتبہ ہے؟ اسی طرح ہندوستان میں اختر الایمان کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کیا گیا...... شاد عارفی آج بھی ہم سے اپنا حق مانگ رہے ہیں۔ اسی طرح مجید امجد اور مختار صدیقی وغیرہ کا مطالبہ بھی صحیح تناظر میں نہیں کیا گیا۔

میں بات سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آج کچھ ایسے پاکستانی شاعر ہیں جن کا کلام ہندوستان کے سنجیدہ ادبی قارئین تک نہیں پہنچا۔ اسی طرح ہندوستان کے کئی شاعر' پاکستان میں محض ایک نام ہیں...... ماضی قریب کے بعض شعراء کو بھی بھلایا جا رہا ہے کیونکہ ان کا اچھا انتخاب نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر روش صدیقی' سکندر علی وجد' سہا بھوپالی مجددی' ثاقب کانپوری' نشور واحدی' اثر لکھنوی' مسعود اختر جمال وغیرہ۔ اسی طرح بہت سے اچھے زندہ شاعر فکر معاش کی

بوجھ تلے یوں کچلے گئے کہ ان کی آواز بھی کھوگئی۔ کانپور میں ایک بزرگ شاعر ہیں حق بنارسی۔ غربت کے موضوع پر ان کا یہ شعر دیکھیے اور بتایئے کہ کیا کسی اور نے بھی اس شدت سے اس موضوع پر ایسا شعر کہا ہے؟

تو تو ہر چہرہ کو آئینہ بنادیتی ہے
اے غریبی کوئی رکھے ترا پردہ کیسے؟

مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ شعری انتخاب مرتب کرتے ہوئے ہمیں صرف شہرت کو بنیاد نہیں بنانا ہے بلکہ اچھے شعراء کو دریافت کرنا ہے۔ مزید یہ کہ جو شعری مجموعے موجود ہیں ان میں سے ہر ایک میں ایسے اشعار مل جائیں گے جو انتخاب سخن میں شامل کئے جا سکیں۔ ہمارا عہد عام شعور اور بیداری کا عہد ہے۔ یہ شعور ہمارے شعری ادب میں زیادہ نمایاں ہے۔ ہمارے نئے شعراء میں بعض اپنی شخصی شعری زبان کی تلاش میں مصروف ہیں (مثال کے طور پر محمد اظہار الحسن اور علی اکبر عباس) بعض شاعرات نسوانی حسیات کو ثقافت کے پس منظر میں پیش کر رہی ہیں اوان کے ہاں بدن دریدگی سے زیادہ ثقافتی لباس کی تراش خراش ملتی ہے۔ (یاسمین حمید)۔ بعض شعراء کے ہاں ادبی روایات آج کے مسائل' موضوعات اور انداز فکر کے ساتھ مل کر ایک نئی روایت بن گئی ہیں (پروین شاکر افتخار عارف' علیم' سلیم کوثر اور محمد رئیس علوی) بعض شاعر ہمیں اس صنعتی عہد میں شاعری کی اہمیت کا ایک دوسرے زاویے سے احساس دلا رہے ہیں۔ وہ شاعری میں اپنی تھکن کا مداوا تلاش کر رہے ہیں۔ شاعری ان کی شناخت اور پیشہ نہیں بلکہ ان کے لئے زیست کرنے کا بہانہ اور وسیلہ ہے۔ (مشتاق احمد قریشی)۔ انتخاب سخن کا سلسلہ شروع ہو تو یہ نکات روشن تر ہو جائیں گے۔ میری بات اور دعوے کی دلیل ان شعرا کے شعر ہی ہو سکتے ہیں۔ پس چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لیجئے پہلے محمد اظہار الحق جو اسلامی تاریخ بالخصوص ہسپانیہ کو اردو غزل کے استعاروں کی صورت دے رہے ہیں۔ پہلے نعت کے دو شعر۔

میں ہر آواز سے اپنی سماعت کو بچا کر
مقدس آہٹیں ان عرش قدموں کی سنوں گا
زہے وہ گرد جو ان کی سواری نے اڑائی
میں آنکھوں میں کہاں تک محض بنیائی رکھوں گا

اور اب تاریخ کو غزل بنتے دیکھئے۔

شہتوت کا رس تھا' نہ غزالوں کے پرے تھے
اس بار بھی میں جشن میں تاخیر سے پہنچا

....

ہمارا نام بھی بارہ دری پر نقش کرنا
یہ ساری جالیاں ہم نے نگاہوں سے بنی ہیں

....

گیا جو لوٹ کر گھوڑا' سوار اس پر نہیں تھا
محبت رفتہ رفتہ عاشقوں کو کھو رہی تھی

....

تیغ کی دھار میں الحمرا' موتی کی آب میں الحمرا
اک محراب میں سورج ہے اور اک محراب میں الحمرا

علی اکبر عباس بھی اپنی زبان اور لہجہ تراشنے کی کوشش میں مصروف اور مبتلا ایک شاعر ہے۔ اس کی فکر اپنی ہے' فیض صاحب نے انگلی کے اشارے سے اسے 'کوئے لباں' کا جلوہ دکھایا ہے۔ اردو غزل کی روایات کے ساتھ ساتھ پنجابی شاعری کے ابواب بھی اس کے سامنے ہیں۔ مناظر سب وہی ہیں جو ہم آپ دیکھتے ہیں مگر علی اکبر عباس اپنے ''درِ نگاہ'' سے دیکھتا ہے۔

سکوتِ گریہ پہن کر دعائے درد انگیز
درِ نگاہ سے کوئے لباں سے نکلی ہے

....

چلتا رہتا ہوں مسلسل کہ نہ لٹ جائے کہیں
ایک اندیشہ کہ شامل مرے اسباب میں ہے

....

جو حرف زندہ کروں گا' مجھے دعا دے گا
میں کچھ نہ دوں گا اسے تو مجھے وہ کیا دے گا

یوں آج کا اردو شاعر لفظوں کو زندہ کرنے کے عمل میں مصروف ہے۔ لفظوں کی زندگی ہے کیا؟ نئے خیالات' نئے ہیجانات اور نئی نظر کا ساتھ دینا اور ان کا اظہار کرنا۔ آج کا شاعر پرانی زمینوں میں نئے جذبے بو رہا ہے اور پرانی ردیفوں اور قافیوں کے افق پر نئے چاند ستارے بکھیر رہا ہے۔ ایک نہایت پرانی زمین میں محمد رئیس علوی کے یہ شعر سنیے۔

گلا بیٹھا ہے کٹنے کی ہوس میں ہچکیاں بھر کر
چلا ہے کوئی ترکش میں قفس کی تیلیاں بھر کر
یہاں تو حرف کا ہونٹوں پہ آتے دم نکلتا ہے
دل دیوانہ دامن میں چلا ہے عرضیاں بھر کر

یاسمین حمید میرے لئے بھی ایک بالکل نیا نام لیکن بہت مانوس آواز ہے۔ اس آواز میں الفاظ کے ساتھ سُر اور لے کا رشتہ ہے۔ موسیقی اور شعر کے امتزاج کا عمل۔ یاسمین حمید اپنے اندر کے فنکار کو جانتی تھی اور اسی فنکار نے شاعری کے وسیلہ کو چن لیا۔ یہ سچ اور ذات کی شاعری ہے۔

ہم نے کسی کو عہد وفا سے رہا کیا
اپنی رگوں سے جیسے لہو کو جدا کیا

صدا بلند ہے اتنی کہ کان پھٹتے ہیں
ہے اذن ایسا کہ گونگا بھی بولنا چاہے
کھو گیا کثرت گویائی کے ہنگامے میں
ایک جو حرف تھا گفتار میں دانائی کا

یاسمین کی شاعری ''بازنان حروف گفتن'' تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ عشق کے معاملات خام کا نام بھی نہیں بلکہ یہ وہ حرف دانائی ہے جو گفتگو کے بازار میں گم ہو کر شاعرہ کے دل میں جاگزیں ہوا اور اس کتاب (پس آئینہ) کے صفحات پر آبسا۔

مشتاق احمد قریشی حرف وصدا کی دنیا میں فنکار بھی ہیں اور تاجر بھی۔ تجارت ایسی کہ لکھنے والوں کو آبرو سے دانہ گندم ملنے لگا۔ اس مصروفیت میں جب تھک جاتے ہیں تو نغمۂ شعر کا سہارا لیتے ہیں۔ روحانیت ان کی ذات کا ایسا رنگ ہے جسے انہوں نے رومانیت اور شوخ رنگوں میں چھپانا چاہا ہے، مگر دیکھئے کہ وہ حقیقت اور مجاز کی بزم مشترکہ کیسے سجاتے ہیں۔

ان کے دل سے ہے نور بزم حیات
آپ جلتا نہیں دیا دل کا

مشتاق قریشی کی شاعری میں بے شاخ کلیوں کا ماتم بھی ہے اور اپنی تلاش بھی۔

آدمی کیسے اور کتنا تنہا ہوتا ہے، چھپانے کے باوجود یہ موضوع مشتاق کی شاعری میں ابھرتا ہے۔ ان کی شاعری جبر و اختیار کی ایک نئی شرح ہے۔

اور میں ہوں بگولے کی مانند
اپنی ذات میں تنہا
تپتے صحرا میں
چکراتا ہوا

پانچ نسبتاً نئے اور کم معروف شعراء کی مدد سے میں نے ''انتخاب سخن'' کا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے اور اب ایک خوشخبری، کم سے کم دو جلدیں میرے پاس تیار

ہیں۔ایک پاکستانی شعراء کا انتخاب (ہندوستان میں اشاعت کے لئے) اوردوسرا ہندوستانی شعراء کا انتخاب (پاکستان میں اشاعت کے لئے)

اب ایک اور مسئلہ، ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ دوسری ہندوستانی اور پاکستانی زبانوں کے ادب کے ترجمے اردو رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں اور تراجم کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ پاکستان میں ماہ نو افکار اورنئی قدریں نے سندھی، پنجابی، پشتو، کشمیری اور بلوچ ادب کے تراجم پابندی کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے بھی کئی کتابیں شائع کی یں۔ مثلاً زینت، پنجابی شاعری کا انتخاب اور افکار خوش حال خان، میری رائے میں اب مختلف زبانوں کی عصری شاعری اور افسانوی ادب کے ترجمے مجموعوں کی صورت میں اردو میں شائع ہوں۔ ہمیں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے عصری ادب سے دلچسپی ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ بنگالہ، ہندی، مرہٹی تامل اور تلگو کے جدید ادب کا ایک انتخاب ہر سال اردو میں شائع ہو سکے۔ ساہتیہ اکادمی یہ منصوبہ اپنے ذمے لے سکتی ہے۔

اورآخری تجویز یہ کہ ہندوستان اور پاکستان کے اردوادب کا ایک ایک انتخاب ہر سال انگریزی زبان میں پیش کیا جائے۔ ہو سکے تو اس انتخاب کی اشاعت کی تجویز میں کسی غیر ملکی اشاعت گھر کو شامل کرلیا جائے۔ یہ انتخاب کرنے والے ایماندار اور وسیع النظر ہوں۔ ادھر انگریزی میں ہمارے ادب کے جو انتخابات شائع ہوتے ہیں وہ ''لابی بازوں'' کے کارنامے ہیں۔ ایسے انتخابات کہ شاعر کی حیثیت سے وزیر آغا اور زاہد ڈار تو شامل ہوں مگر راشد، اختر الایمان اور عزیز حامد مدنی شامل نہ ہوں۔ حقیقی ادیب اپنے مفادات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا۔ سچے حرف کے سوا اُس کی کوئی لابی نہیں ہوتی مگر......

اسلام میں تعلیم کے بنیادی تصورات

(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم) کو پیدا کیا' جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔''

حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جو پہلا خدائی پیغام آیا اس کی تلاوت ابھی میں نے آپ کے سامنے کی۔ پہلی سورہ کی یہ پانچ آیتیں حضرت جبرئیل السلام لے کر غار حرا کی خاموشی میں آئے اور دنیا کی شب تاریک سحر ہوگئی۔ روایات کی تاریکیوں کی جگہ علم کی روشنی نے لے لی۔ زندگی جو طلسمِ فلاطون تھی ایک سنگین حقیقت بن گئی۔ خدائے بلند و برتر نے اس مدینہ علم کی تخلیق کی جس کی وسعتوں نے جہالت و جاہلیت کو تمدن و ثقافت کے نقوش میں بدل دیا۔ اندھیروں میں علم کی پہلی کرن طلوع ہوئی اور صحرائے عرب کے ذرے اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ نور کا یہ سیلِ تمدن آموز کائنات انسانی کے ہر گوشے تک پہنچ گیا۔ یہ روشنی اور علم صرف خارجی دنیا کے لئے وجہ انقلاب نہ بنا بلکہ انسان کا ذہن بھی منور ہوگیا۔ اس کی وحشی جبلتیں رام ہوکر انسانیت و تمدن کی تزئین و آرائش میں مصروف ہوگئیں۔

ان پانچ آیتوں پر غور کیجئے' خالق کائنات نے پہلے تخلیق کائنات کا ذکر کیا......اور اس فضا کو انسان کی تخلیق سے معمور کر دیا ورنہ کائنات کا عظیم اسٹیج اپنے مرکزی کردار سے محروم رہتا اور پھر خدا نے اپنے کرم سے انسان کو لامحدود قوتیں بخشیں اور ان قوتوں کو علم نے جلا دی۔

علم جو پہلے روایات کا سفینہ تھا' قلم کی مدد سے بنیادِ مستحکم بن گیا۔ پھر کائنات کے پردے اٹھتے گئے اور انسان حقیقتوں سے قریب تر ہوگیا۔ وہ باتیں سیکھ گیا جو نہیں جانتا تھا۔

جو کچھ انسان سیکھتا گیا اس میں ترتیب و تنظیم پیدا کرتا گیا۔ اس کا مطالعہ' مشاہدہ اور تجربہ

جب ہم آہنگ ہوئے تو عمرانی اور طبعی علوم کے چمن مسکرا پڑے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ انسان کے علوم کے دائرے بڑھتے جا رہے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز ہی علم کے حقیقی اور گہرے شعور سے ہوتا ہے۔

اب ذرا گردشِ دوراں سے بے نیاز ہو کر خلافت انسانی پر ایک نگاہ ڈالئے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ''علم'' ہی وجہ خلافت ہے۔

علم کے بارے میں میں نے یہ اشارے اس لئے کئے تا کہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکیں کہ انسانی عظمت وکرامت کی بنیاد خدائے بلند و برتر نے علم پر رکھی ہے۔ علم پر جب بھی روایات کے پردے پڑے، تقلید آباء نے احکام خداوندی کی جگہ لی تو انسانیت گمراہ ہوگئی اور خدا نے کسی دوسرے پیغمبر کو انسانوں کی طرف بھیجا۔ پیغمبروں کا مقصد علم کو پھیلانا، لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھانا، حقیقتوں کو ظاہر کرنا اور اخلاق کی تکمیل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبین ہیں اور ساری انسانیت کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے۔ اسی لئے آپ مُعلّمِ اعظم ہیں۔ اس عظمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ کی حکمت اور آپ کا علم عالم گیر بھی ہے اور وقت کے دائروں سے بالاتر بھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''انما بعثت معلما'' یعنی مجھے معلم بنا کر مبعوث کیا گیا۔

ان چند تمہیدی خیالات کے بعد ذرا آج کی دنیا کے ترقی یافتہ تعلیمی نظام پر نگاہ ڈالئے۔ ہمارا یہ دور پرنٹنگ پریس، رسالوں اور کتابوں کا دور ہے۔ کسی ترقی یافتہ زبان کی تحصیل کے بعد علوم وفنون کے دروازے ہم پر کھل جاتے ہیں۔ ہم اپنے طور پر علم حاصل کر لیتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''پھر کالج اور یونیورسٹیاں کیوں قائم کی جاتی ہیں؟ طلباء مخصوص دانش کدوں اور دانش گاہوں سے اپنی وابستگی پر نازاں کیوں ہوتے ہیں؟ اساتذہ کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سوالات بڑے اہم ہیں۔ ان سے ہمارا علمی اور تمدنی مستقبل وابستہ ہے۔ مشہور مفکر پروفیسر وائٹ ہیڈ نے بڑے واضح اور مضبوط طریقہ پر ان سوالوں کو حل کر دیا ہے۔ ان کا یہ کہنا

بالکل صحیح ہے کہ یہ تعلیمی ادارے طلباء کے ذہن پر اپنی مُہر لگادیتے ہیں۔ ان اداروں کی ایک مخصوص فضا ہوتی ہے اور اس فضا کے خالق معلم اور اساتذہ ہوتے ہیں۔ یہ ایک بڑی حقیقت کا اظہار ہے۔ معلم، طلباء کو کتاب خوانی کی منزل سے بلند کر کے اپنی شخصیت کے اثر سے زندگی کا رازداں بنا دیتے ہیں اور پھر معلم صرف کلاس روم ہی میں معلم نہیں ہوتے بلکہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ اور کوئی ساعت ایسی نہیں ہوتی جب وہ معلم نہ رہتے ہوں۔ طلباء ان کے افکار وخیالات حتٰی کہ چال ڈھال سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ ان کے اساتذہ جن کتابوں کو عظیم کہتے ہیں۔ ان کتابوں کے خیالات، ان کے اعمال کے قالب میں ڈھلے یا نہیں؟ اگر معلم کی نظری تعلیم اور اس کی عملی زندگی میں فرق ہوتا ہے تو طالب علم مایوس ہو جاتے ہیں۔ علم لباس نہیں جسے ہم اپنے ادنیٰ مفادات کے لئے اتار پھینکیں اور وحشی بن جائیں۔ حقیقی علم تو خون بن کر ہمارے وجود میں گردش کرتا ہے۔ بقول پیر رومی۔

علم رابرتن زنی مارے بود

علم رابرجاں زنی یارے بود

اس معیار کے مطابق اگر آپ معلمین عالم کو پرکھیں تو شدید مایوسی ہوگی۔ فرانسس بیکن جس سے مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتداء ہوتی ہے عملی زندگی میں بے حد غیر اخلاقی وغیر انسانی حرکات کا مرتکب ہوتا تھا۔ یونان کے فلسفی جو معلمین عالم میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں وہ بھی عملی زندگی میں اپنے نظریات سے بہت چھوٹے تھے۔ رہے شاعر تو ان کی پیروی کرنے والوں کو قرآن نے گمراہ کہا ہے اور اس کی وجہ بتا دی ہے، یعنی وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ علم کے سلسلے میں معلم کی اہمیت پر ذرا غور فرمائیں۔ معلم کی ذمہ داریاں بیکراں ہیں۔ اس کے عمل کو علم کا مکمل پرتو ہونا چاہئے۔ یہ عمل انسانی معاشرے یا کم سے کم کسی درس گاہ میں ہی پروان چڑھ سکتا ہے۔ اس معیار پر صرف انبیائے کرامؑ پورے اترتے ہیں۔ خدا کے لئے تو یہ بھی ممکن تھا کہ وہ توریت،

زبور، انجیل اور قرآن پاک پہاڑوں پر نقش کر دیتا لیکن یہ ساری کتابیں ہمیں پیغمبروں کے ذریعے ملی ہیں۔ اس بات کو بھی پیش نظر رکھیے کہ نزول وحی ہمیشہ بتدریج ہوتا ہے اور زندگی کے مختلف مراحل کے مطابق اور انبیائے کرام نے خدا کے ہر حکم پر عمل کر کے اس کی عملیت کو ثابت کر دیا۔ حضور اکرم کی حیات طیبہ تاریخ کی روشنی میں جگمگا رہی ہے۔ یتیمی، غور و فکر، تلاش حق، نبوت، مکہ والوں کے مظالم، ہجرت، مدینہ میں اسلامی معاشرے کی تکمیل، جزیرہ نمائے عرب کا آپ کے قدموں پر جھک جانا۔ ان میں سے ہر منزل میں آپ نے وحی الٰہی کو عملی طور پر برتا اور اپنے عمل کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تاریخ کی نگاہوں نے ایسا معلم نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ کبھی دیکھ سکیں گی جو اپنے خدا اور اپنی تعلیم کی ایسی عملی تصویر اور تفسیر ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے جب کسی عاشق رسولؐ نے کہا۔ ''حضور کی سیرت کا کچھ حال بتائیے؟'' تو انہوں نے فرمایا۔ ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟'' میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ معلم کے لئے انسانی معاشرہ یا کم سے کم کوئی درس گاہ ضروری ہے۔ انسانیت کے معلم اعظم نے ایسے معاشرے کی تشکیل فرمائی اور اسے اپنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال دیا۔

☆

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معلمانہ عظمت اور ہمہ گیری کا مطالعہ کرنے سے پہلے ہمیں ایک اور بنیادی سوال پر غور کرنا ہے۔ وہ سوال ہے ''نظام تعلیم اور تعلیم کی نوعیت''۔ دنیا کی تعلیمی تاریخ خاصے تجربوں کے بعد موجودہ منزل تک آئی ہے۔ آج پوری دنیا میں کئی نظام تعلیم رائج ہیں۔

اشتراکی نظام تعلیم میں فرد کی خودی پوری طرح ابھر نہیں سکتی اور علم ہمیشہ اشتراکی نظریہ کے تحت ہوتا ہے۔ خواہ حقیقت اس کے برعکس کیوں نہ ہو لیکن روس نے اپنے تعلیمی نظام سے ترقی پذیر نوجوانوں کو اپنے اشتراکی نظام کے بہترین کارکنوں میں ضرور ڈھال دیا ہے۔ مشرق کے جو ملک غلام تھے ان پر آزادی کے بعد بھی غیر ملکی نظام تعلیم مسلط ہے جس کی ایک مثال ہمارا

اپنا وطن پاکستان ہے۔ یہ نظام تعلیم شیروں میں روباہی پیدا کرتا ہے۔ شاہین بچوں کو فریب دے کر کرگس بناتا ہے اور باغی نوجوانوں کو کلرکوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اکبر نے ایک شعر میں یہ دل خراش داستاں پیش کر دی ہے

یوں قتل سے بچوں کے بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

مغرب کے بعض ترقی یافتہ ملکوں کا نظام تعلیم فرد کا احترام کرتا ہے۔ شخصیت کو کچلتا نہیں۔ تجربہ کی کسوٹی پر حقیقت کو پرکھنا سکھاتا ہے' ہر چھپے ہوئے امکان کا جائزہ لینے کا سبق دیتا ہے لیکن یہ نظام تعلیم بھی معاشرے میں ہمواری پیدا نہیں کرتا۔ خیر و شر اور انسانیت کے نفع و ضرر کا کوئی قطعی معیار پیش نہیں کرتا' اسی لئے ابھی تک تجرباتی دور میں ہے۔

یہ ہوئی عملی صورت۔ جہاں تک نظریات کا تعلق ہے' نت نئے تعلیمی نظریے ہمارے دور میں پیش کئے گئے ہیں جن کے خاص نکات یہ ہیں۔

۱۔ تعلیم سے فرد کی صلاحیتیں ابھرنی چاہئیں۔
۲۔ تعلیم فرد کو اپنی قوم کا جزو لاینفک بنا دے۔
۳۔ حقیقتوں کی تلاش تعلیم کا مقصد ہے۔
۴۔ تعلیم کو قومی روایات کا آئینہ ہونا چاہئے۔
۵۔ تعلیم ایسی ہو جو انسان کو تسخیر کائنات میں مدد دے۔

یہ ساری باتیں بڑی خوش آئند ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ جدید تعلیمی نظریے انسان کے لئے آئینِ حیات نہیں بن سکے اور ان سے آدم کو ثبات حاصل نہ ہو سکا۔ اسی لئے تسخیر کائنات کا عمل ہماری دنیا کو استحکام کی جگہ بربادی کی طرف لئے جا رہا ہے۔ آج کی تعلیم انسانی تمدن کی شیرازہ بندی نہیں کرتی' کیونکہ اس کی بنیاد عقل انسانی پر رکھی گئی ہے اور یہ عقل زمان و مکاں کی اسیر بھی ہے اور خود غرض بھی۔ آج کا ذہن اپنے وطنی مفاد کے آگے سوچنے سے انکار کر دیتا

ہے۔ امریکہ کا ہر ماہر تعلیم کہتا ہے کہ ''حقیقتوں کی تلاش تعلیم کا مقصد ہے۔'' مگر امریکی قوم اشتراکی چین جیسی بڑی حقیقت کو مدتوں تسلیم کرنے سے انکار کرتی رہی۔

یہ سنگین صورت حال ساری دنیا اور انسانیت کے مستقبل کے لئے خطرہ کا سرخ نشان ہے۔ تعلیم ہی نئی نسل اور افکار تازہ کی اساس ہے' اور افکار تازہ سے جہان نو پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہی اساس کج نگاہی و کج روی کی بنیاد بن جائے تو اندھیروں کے سوا ہمارے مستقبل میں کیا ہوگا؟

آیئے اب ہم دیکھیں کہ مُعلّمِ اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے خدا نے ہمیں علم و حکمت کا کیا معیار اور تصور عطا کیا ہے؟ اس علم و حکمت کی نوعیت کیا ہے؟ اور اس سے حال و مستقبل انسانیت کے کون کون سے مفادات عالیہ وابستہ ہیں؟ خدا کے تصور علم و حکمت کو معلم اعظم نے عمل کے سانچے میں کس طرح ڈھالا؟ اور اس علم کے سہارے انسانی تمدن و معاشرت' فکر و تفکر کو کس طرح متاثر کیا؟

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرفی معانی میں اُمی تھے اور وہ اس لئے کہ وحی الٰہی ان کے علم کا منبع اور سرچشمہ ٹھہرا۔ وہ ذرائع نہیں جن میں ظن اور گمان شامل ہیں۔ علم کے معانی ہی اسلام نے حقیقت کے قرار دیئے۔ حقیقت کا ادراک علم ہے اور یہ علم ظن اور گمان کی ضد ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا کہ جو اَن پڑھ ہوتے ہیں وہ خیالات باطل کے سوا کسی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اور ظن و گمان سے کام لیتے ہیں۔ اس تعریف کے پیش نظر فلسفۂ یونان' حکمتِ روما' دانش ہندی اور آگاہیٔ چین کو علم کہنا ممکن نہیں۔ حقیقت تک رسائی علم کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے۔ جاہلیت کا لفظ نور کے ساتھ ساتھ علم کی ضد بھی ہے۔ یوں علم نور ٹھہرا اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن کو ابوجہل کہا گیا' ابوالکفر نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے ہمیں یہ علم عطا کیا گیا کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے' یہ کوئی سوانگ یا ناٹک نہیں۔ یہ ضابطہ اور قانون کے تابع ہے۔ کائنات کے بالحق ہونا حقیقی علم

ہے۔اسی طرح علم کو خیر وشر کا معیار قرار دیا گیا اور وحی الٰہی کو علم کہا گیا۔ یہی علم دلوں میں خشیت الٰہی پیدا کرتا ہے اور حضور کے ذریعے ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ اللہ کے عالم بندے ہی اس سے ڈرتے ہیں۔

علم وہ ہے جو انسان کو ظلمت سے روشنی کی طرف لائے۔ ''اللہ وہی ہے جو اپنے رسول پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تاکہ وہ تم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے۔ اللہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔'' (سورہ الحدید)

اللہ تعالیٰ اپنے دعوؤں کو علم کی بنیادِ محکم پر پیش کرتا ہے اور وہ ارشاد فرماتا ہے کہ وہ ''اپنے احکام کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں علم ہو اور تم سوچو'' اور ''اگر تم سچے ہو تو قرآن کی ایک آیت کے مثل ہی کوئی چیز لے آؤ۔''

قرآن حکیم نے کفار کو یہی چیلنج کیا ہے کہ

"ھاتوابرھان کم انکنتم صادقین"

''تم اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔''

علم کے درجہ کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شعور اور عرفان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں شامل نہیں فرمایا بلکہ ان منازل کو اپنے رسول کے مرتبہ سے بھی فروتر سمجھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''عارف'' اور ''شاعر'' نہیں کہا' بلکہ شاعر ہونے کا اتہام تو مشرکین اور کفار نے لگایا۔ مومن کی زندگی اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم ہے اور اس نے اس علم کا جو حصہ ظرف بشر کے مطابق جانا اسے اپنے رسولوں اور بالخصوص رسول آخر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا۔ یوں رسول کے فرائض منصبی میں تعلیم سب سے نمایاں فرض بن کر ابھرتی ہے۔ یہ فرائض رسالت قرآن حکیم میں کئی مقامات پر پیش کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر۔

یتلو علیھم آیٰتہٖ ویزکیّھِمْ وَیُعلّمھم والکِتٰب وَالْحِکمۃَ

''رسول انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت فرماتا ہے۔ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

''حکمۃ'' کی صفت معلم ربانی کے طریق کار کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔وہی نکاتِ وحی کو سُننے والوں کی سمجھ اور احوال وکوائف کے مطابق پیش کرتا ہے۔حکمت کے معانی ہیں ''بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعے جاننا'' (لسان العرب) اور ''علم اور عقل کے ذریعے سچی بات تک پہنچنا'' (مفردات القرآن) خود حقیقت کو جاننے اور پہنچنے کے بعد معلم سچی بات کو اپنے طالب علموں تک پہنچاتا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فریضہ کس طرح انجام دیا؟ اس کی شہادت آپؐ کے صحابۂ کرام کی زندگیاں ہیں۔وہ لوگ جو صداقت، علم وحکمت اور خیر کے نمائندے اور علامت بن گئے۔

ہمارے معلم (ہمارے ماں باپ انؐ پر فدا ہوں) نے علم کو بلند ترین درجۂ عبادت تک پہنچا دیا۔آپؐ نے علم کی ایسی فضا قائم فرمائی جس کی نظیر نہیں ملتی۔غزوۂ بدر کے قیدیوں کا فدیہ مسلمانوں کے دس دس بچوں کو تعلیم دینا قرار پایا۔پہلی اسلامی یونیورسٹی مسجد نبوی کے ایک چبوترہ پر سائبان تلے قائم کی گئی اور اس کے جلیل القدر طالب علم اصحابِ صفہ کے نام سے ہماری تاریخ کا ایک روشن باب بن چکے ہیں۔مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کسی جگہ ایک نہایت دل فروز نکتہ بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ ہر چیز کا ایک سلسلۂ نسب ہوتا ہے جو اسے اعتبار عطا کرتا ہے۔جس قربانی کا سلسلہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی قربانی سے جا کر نہ مل جائے وہ بے اعتبار ہے۔اسی طرح جس جامعہ اور مدرسہ کا نسب مدرسۂ صفہ سے نہ ملتا ہو وہ نور اور علم کا گہوارہ نہیں ہوسکتا۔

ابھی یہ عرض کیا گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے علم کو بلند ترین درجۂ عبادت تک پہنچا دیا۔مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں۔

من سلک طریقا یلتمس فیہ علما سھل اللہ طریقا الی الجنۃ

''جو شخص علم کے حصول کے لئے سفر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کی راہ سہل بنا دے گا۔''

مشکوۃ کی ایک حدیث میں عمل رسولؐ اور قول رسولؐ دونوں موجود ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں آئے۔ وہاں دو جماعتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک جماعت ذکر و تسبیح میں لگی ہوئی تھی اور دوسری جماعت دین کے علم کے حصول میں مصروف تھی۔ آپ نے فرمایا کہ دونوں جماعتیں عمل خیر میں مصروف ہیں لیکن ان میں سے ایک دوسری سے افضل ہے۔ یہ لوگ جو ذکر الٰہی اور دعائے استغفار میں مصروف ہیں اللہ چاہے گا تو انہیں دے گا۔ نہیں چاہے گا تو نہیں دے گا۔ رہے وہی دوسری جماعت والے جو علم کی تعلیم کر رہے ہیں اور جاہلوں کو پڑھا رہے ہیں افضل ہیں اور مجھے معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ اسی جماعت کے ساتھ بیٹھ گئے۔''

اس حدیث سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق تعلیم اور اس کی کامیابی کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں وہ فضا پیدا ہوگئی تھی کہ لوگ ایک دوسرے کو علم دینے لگیں۔ (ویسے صحابہ کرام کی زندگی کی معراج تو یہی تھی کہ خود ذات رسالت مآب سے تحصیل علم و نور کرتے رہیں) طالب علموں کا اس درجہ پر پہنچنا معلم کی حقیقی کامیابی ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تحصیل علم کرنے والی جماعت کے ساتھ بیٹھ گئے تو وہ اپنے عمل میں مصروف رہی۔ یوں معلم کی ایک اور حیثیت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ ہے ممتحن کی حیثیت۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس جماعت قدسی نفساں کے علم کا امتحان بھی لیتے رہتے تھے جسے آپؐ کے بعد علم رسالت کی میراث کو آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کرنا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معلمانہ زندگی کا ایک اہم پہلو معلم اور طالب علموں کا رشتہ ہے۔

اس رشتہ کے کئی پہلو ہیں اور ان میں سب سے نمایاں پہلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم کا تو یہ عالم تھا کہ خود کفار کے لئے بے چین رہتے تھے کہ وہ اپنے کفر کے سبب خاسر اور نامراد رہیں گے اور اہل ایمان کے لئے تو آپ قرآن حکیم کے الفاظ میں ''روف، رحیم'' تھے۔

صحابہ کرام آپؐ سے اس درجہ محبت کرتے تھے کہ آپ کے وضو کے پانی کو زمین پر نہ گرنے دیتے اور میدان جنگ میں پروانہ وار شمع رسالت کے تحفظ کے لئے اپنی جانیں نثار کرتے اور اس محبت وعقیدت اور احترام کی بنیاد دوری پر نہیں بلکہ حد درجہ قربت پر رکھی گئی تھی۔ آپؐ محفل میں کسی امتیاز کے بغیر اس طرح تشریف فرما ہوتے کہ کوئی آنے والا اجنبی آکر پوچھتا کہ ''تم میں سے محمد کون ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخاطب اور طالب علم کی ذہنی استعداد، میلانات اور دوسرے تقاضوں کا لحاظ فرماتے۔ علم کو کبھی بوجھ نہ بننے دیتے۔ جب حضرت عبداللہ ابن مسعود سے کسی صاحب نے کہا کہ آپ ہر دن ہمیں وعظ ونصیحت فرمائیں تو انہوں نے جواب دیا۔

''ہر دن تقریر کرنے سے مجھے یہ خیال منع کرتا ہے کہ تم لوگ اکتا نہ جاؤ۔ میں وقفہ اور ناغہ دے کر وعظ ونصیحت کرتا ہوں جیسے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اور آپ ایسا اس لئے کرتے تھے کہ ہم لوگ کہیں اکتا نہ جائیں۔'' (بخاری ومسلم)

بخاری کی ایک اور حدیث سے جس کے راوی عکرمہؒ اور عبداللہ ابن عباس ہیں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر لوگ کسی محفل میں گفتگو میں مشغول ہوں تو کسی واعظ اور معلم کو جاکر ان کی بات نہیں کاٹنا چاہئے۔ لوگوں کو تعلیم اس وقت دی جائے جب وہ خواہش علم رکھتے ہوں اور اسی طرح زبان آسان ہو، مقفیٰ، مسجع، آرائشی اور بناوٹی نہ ہو۔

آج بھی کوئی معلم ان اصولوں کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ زبان کی آسانی موضوع پر معلم کی

گرفت کا ثبوت ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلوب تعلیم میں ''تکرار'' کے اصول کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ آپ آہستہ لہجے میں بات کرتے اور کبھی کبھی سامعین کے فہم کے مطابق تین مرتبہ بات کو دہراتے۔ آثار و احادیث کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تکرار کے اس عمل میں آپ الفاظ میں جزوی تبدیلی فرما دیتے ہوں گے' کیونکہ ایک ہی مضمون اور موقع کی حدیثوں میں چند الفاظ کی تبدیلی مختلف روایتوں میں ملتی ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے سے حدیث کی روایت اور صحت پر یقین پختہ تر ہو سکتا ہے۔

(۳)

اس مختصر مطالعہ میں اسلام میں علم کی وسعت کے بارے میں چند ارشارے کئے گئے۔ آخر میں اس اجمال کی قدرے تفصیل مناسب ہوگی۔

اسلام کے تصور علم میں معرفت الٰہی' خیر اور کائنات کو سمجھنے اور خالق و مخلوق کے رشتے کی تفہیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن کریم اور زندگی بسر کرنے میں رہنمائی کرنے والا علم یقیناً اولیت رکھتا ہے لیکن اسلام نے علم کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا ہے۔ اسلام زندگی کے کسی شعبے میں ثنویت کو نہیں مانتا۔ آج بدنصیبی سے ہم ''دینی'' اور ''دینوی'' علوم کی تقسیم میں یوں الجھ گئے ہیں کہ علماء دینوی علوم کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور جامعات کے سند یافتہ ''کٹھ ملاؤں'' کے نام اور عنوان سے علماء کی تحقیر کرتے ہیں۔ قرآن حکیم اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے انفس اور آفاق کی تمام نشانیوں اور حقائق کو حدود علم میں شامل کر دیا ہے۔

سورہ البقرہ میں آسمانوں کی پیدائش' زمین کی پیدائش' شب و روز کے رد و بدل' سمندروں میں جہازوں کے سفر' بارش اور بارش سے زمین کے زندہ ہونے اور حیوانات کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ کتنے ہی علوم کی زمرہ بندی ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے پہلی بار تاریخ کو ایک یقینی اور حقیقی علم کا درجہ دیا ہے۔ ایسا علم جس میں منفعت انسانی کے کتنے ہی پہلو ہیں۔ اقوام سابقہ کے قصوں میں عقل والوں کے لئے بصیرت اور عبرت ہے۔

ولقدکان فی قصصهم عبرۃ لا ولی الالباب

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان

یہاں علم کی وحدت کے حوالہ سے اس کی دونوں بڑی شاخوں کا ذکر کیا گیا یعنی علم دو ہیں، دین کا علم اور علم ''ابدان'' ابدان کی اصطلاح کی معنویت آج کے عہد میں زیادہ آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے۔ آج ہم ''bodles'' کا لفظ مختلف علوم میں اہم اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہی مثلاً اجرام فلکی کے لئے

''Heavanly Bodles''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو وہ علم عطا کیا جو علم نافع ہے، جو حیات طیبہ اور اخلاق حسنہ کی بنیاد ہے، جو فکر کی تصحیح کرتا ہے اور سیرت سازی کا فرض انجام دیتا ہے اور جس کے نتیجے کے طور پر آدمی اللہ کی ذات سے قریب تر آجاتا ہے۔ اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کے الفاظ میں۔

''عالم میں خاک کی طرح تحمل پیدا ہوجاتا ہے۔ تکبر کا نشان بھی نہیں رہتا۔ علم جیسے جیسے زیادہ ہوتا ہے۔ اللہ کا خوف، تواضع اور انکسار زیادہ ہوتا جاتا ہے۔''

اساتذۂ کلیاتِ کراچی کانفرنس

۱۹۶۰ء

ہمارا نظامِ تعلیم اور فکری و علمی آزادی

ہر انسانی معاشرہ ایک ایسا نامیاتی وجود ہوتا ہے، جس میں ارتقاء کے ساتھ ساتھ وحدت بھی ہوتی ہے۔ اگر عوام معاشرے کے دھڑکتے ہوئے دل کا درجہ رکھتے ہیں تو جامعات کو اس کا ذہن قرار دیا جاسکتا ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک متوازن اور صحت مند معاشرے میں جامعات کو وہی فریضہ انجام دینا چاہیے جو انسانی جسم میں دماغ انجام دیتا ہے۔

ہر انسانی معاشرے کی بنیاد چند بنیادی اقدار پر رکھی جاتی ہے۔ ہم کسی معاشرے کی قدر و قیمت کا تعین اس کے آورش اور مجموعی نصب العین سے کرتے ہیں۔ میں معاشرے کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ ریاست، منظم معاشرہ ہی تو ہے۔

ہم نے ایک نظریۂ حیات کے نام پر یہ ملک حاصل کیا تھا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اور اس کے بعد پاکستان کی ۱۹ سالہ تاریخ میں یہ بات دہراتے دہراتے کوئی نہیں تھکا کہ پاکستان اسلامی اصولوں کا گہوارہ ہے۔ اس ضمن میں عدلِ عمرانی، مساوات، اخوت، آزادی اور انسان کی قوتِ تسخیر کا بار بار ذکر کیا گیا لیکن بدنصیبی سے محض نعرے کے طور پر۔

اسلام کی عطا کردہ بنیادی اقدارِ حیات کیا ہیں؟ ان کو ہم اپنے نظامِ تعلیم میں کس طرح جگہ دے سکتے ہیں، مختلف عمرانی علوم میں اسلامی تعلیمات سے طلباء کو کس طرح روشناس کرایا جا سکتا ہے؟ ان سوالات سے بچنے کے لیے لیپا پوتی کے لیے اسلامیات کو ایک جداگانہ مضمون کی حیثیت سے نصاب میں داخل کر کے ہم نے حقائق سے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کا سبب کیا ہے؟ حصولِ اقتدار کی جنگ اور ذاتی اغراض سے قطع نظر میری ناچیز رائے میں اس صورت حال کی ایک وجہ فکر کی آزادی کا فقدان رہی ہے۔ آزادئ فکر کے راستے میں علم کی کمی کے ساتھ ساتھ مختلف رکاوٹیں حائل رہی ہیں۔ ہمارے دیس میں بارہا قومی تقاضوں اور علمی مسائل

نے عوامی رائے عامہ یا سیاسی دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ان رکاوٹوں کی نشان دہی کی چنداں ضرورت نہیں لیکن شاید یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس صورت حال کو متوسط طبقے کے المیہ نے جنم دیا ہے۔ متوسط طبقہ برطانوی عہد کی پیداوار ہے اور اسی طبقہ نے تعلیم' سیاست اور معاشرتی تحریکوں کی رہنمائی منزلِ آزادی تک کی ہے۔ یہی متوسط طبقہ آج معاشی جبر کی وجہ سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ آج سیاست جاگیرداروں' وڈیروں اور سرمایہ داروں کی کنیز ہے۔ اب اس فہرست میں فوج اور نوکر شاہی کو بھی شامل کر لیجئے۔

تعلیم یا اعلیٰ تعلیم کا مقصد محض معلومات کا اکٹھا کرنا نہیں ہے اور اب یہ بات ممکن بھی نہیں رہی۔ آج معلومات میں جس تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اس کی مثال انسانی تاریخ کے کسی دَور میں نہیں ملتی۔ کسی نے تمثیلاً کہا ہے کہ یونانیوں کے عہد سے بیسویں صدی کے آغاز تک کی معلومات کو اگر ہم مرتبانوں میں جمع کر سکیں تو چار مرتبان بھر جائیں گے لیکن ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کی معلومات کے لیے بھی دو مرتبانوں کی ضرورت پڑے گی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کی معلومات کے لیے چار مرتبانوں کی ضرورت پڑے گی۔ علیٰ ھذا القیاس...... مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں ۱۹۶۶ء تک کے معلوماتی مرتبانوں کا حساب آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ ایسی صورتِ حال میں اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کو ذرا بلند سطح پر تلاش کرنا ہوگا۔ یہ مقاصد متنوع اور پھیلے ہوئے ہیں مثلاً

(۱) اعلیٰ تعلیم کا مقصد افراد کی ایسی ذہنی تربیت ہے جو ایک طرف افراد کی صلاحیتوں کو اُبھارے اور دوسری طرف فرد اور معاشرے کے درمیان ربط اور توازن پیدا کرے۔

(۲) متوازن شخصیت علمی تجزیہ' جستجو اور تحقیق کے بغیر نہیں بن سکتی۔

(۳) اعلیٰ تعلیم کا مقصد فرد اور فرد' فرد اور جماعت' انسان اور کائنات کے درمیان رشتوں کی تلاش اور ان کا تعین ہے۔

(۴) اعلیٰ تعلیم معاشرہ کا احتساب ہے' ایسا احتساب جو خودنگری' خودگری اور خودشکنی سے جنم لیتا

ہے۔

یہ مقاصد یا ان میں سے کوئی مقصد فکری اور علمی آزادی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ فکری اور علمی آزادی ہی قوت تخلیق کا سر چشمہ ہے اور اس کا یہ مطالبہ کوئی نیا مطالبہ نہیں ہے۔ ملٹن کی آواز صدیوں کا فاصلہ طے کر کے ہم تک آ رہی ہے۔ یہ آواز جو ہمارے اور ماضی کے درمیان ایک پل ہے۔

"Give me the liberty to know, to utter and to argue freely according to my conscience, above all liberties."

جان اسٹورٹ مل کے افکار میں خواہ آج ہمیں کہیں کہیں تناقص اور تضاد کیوں نظر نہ آئے، لیکن اس کے بنیادی استدلال کے یہ دونوں پہلو وقت کی گردشوں پر غالب آئے ہیں۔

(۱) رائے کا چھپانا حق کو ختم کر سکتا ہے، کیوں کہ یہ بات ممکن ہے کہ غیر روایتی رائے درست ہو (جس طرح روایتی رائے درست ہو سکتی ہے)۔

(۲) اگر کوئی رائے غلط ہے تو اس غلطی کی نشان دہی سے صداقت کی خدمت ہو گی اور اس کو کچلنے سے صداقت کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

انیسویں صدی کی عقلیت پسندی کا یہ تحفہ ہماری بزم میں سر سیّد احمد خاں لے کر آئے تھے۔ ان کے مضمون "آزادیٔ رائے" پر on liberty کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اپنے مضمون کے آغاز میں انہوں نے خود بھی یہ بات کہی ہے کہ "ہم اپنے اس آرٹیکل کو ایک بڑے لائق اور قابل زمانۂ حال کے فیلسوف کی تحریر سے اخذ کرتے ہیں۔" بہر حال چراغ سے چراغ جلتا ہے اور آزادیٔ فکر کی مشعل یوں ہی ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر طے کرتی ہے اور ہر طرف چراغاں ہوتا جاتا ہے۔ سر سیّد نے علمی اور فکری آزادی کی اہمیت کے سلسلے میں اپنے اِسی مضمون میں یہ تاریخی الفاظ لکھے ہیں۔

"رایوں کا بند رہنا خواہ بہ سبب کسی مذہبی خوف کے اور خواہ بہ سبب اندیشۂ برادری اور قوم کے، اور

خواہ بدنامی کے ڈر سے اور یا گورنمنٹ کے ظلم سے' نہایت ہی بُری چیز ہے۔ رایوں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور کُل انسانوں کو ہی نقصان پہنچتا ہے اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو بلکہ ان کو بھی جو آئندہ پیدا ہوں گے۔"

معاشرے کی بنیادی قوتوں میں سے ایک قوت یہی فکری اثاثہ ہے۔ یہی فکری اور علمی آزادی ایک طرف ایسے صاحبانِ کردار کو جنم دیتی ہے جن کے ذہن ہر قسم کی اُلجھنوں سے صاف ہوتے ہیں اور جو چٹان ک طرح جم کر مسائل کا مقابلہ کرنا جانتے ہیں۔ دوسری طرف یہی علمی آزادی روحانی اور مادّی دُنیا کے درمیان توازن پیدا کرتی ہے۔ "لب بند دچشم بند گوش بند" کو اپنا کر ایک مہجور صوفیانہ طرزِ عمل کے سوا کچھ اور نہیں مل سکتا' اور نہ ہی ہم دُنیا کو کچھ دے سکتے ہیں۔

مسلمانوں نے عالمِ انسانیت کو جو کچھ دیا ہے وہ اسی علمی آزادی کے سہارے۔ قرآن حکیم نے ایک طرف تو اہلِ ایمان کی نشانی یہ بتائی ہے کہ یہ لوگ اندھے اور بہرے ہو کر اس کتاب پر نہیں گرتے اور دوسری طرف اپنے نہ ماننے والوں اور مخالفوں سے بار بار یہ کہا ہے کہ "تم اپنی "بُرہان" لاؤ اگر سچے ہو"...... لیکن ہمارے عہدِ زوال نے ہم سے وہ کھلی ہوئی آنکھ اور حقائق کا ادراک رکھنے والا ذہن چھین لیا جو قرآن نے عطا کیا تھا اور آج سیاسی آزادی کے حصول کے بعد بھی علمی دُنیا میں وہی ہو رہا ہے جو ہماری فقہ کے ساتھ ہوا۔ اجتہاد کے سارے دروازے بند ہیں اور ان دروازوں پر کہیں تکفیر کے' کہیں معاشرے کی دشنام طرازی کے اور کہیں احتساب کے موٹے موٹے تالے پڑے ہیں۔ اس فضا کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحقیقی کام آج بھی ہو رہا ہے' مگر اعداد و شمار' نقشوں اور مختلف شہادتوں کا فریضہ معاشرے یا حلقۂ اقتدار کے طے شدہ اور تسلیم کردہ مفروضات و عقائد کو درست ثابت کرنا ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے مسلمانوں کا ہر فرقہ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے عقائد کو قرآن سے ثابت کرنے کے لیے قرآن کا مطالعہ کرتا ہے۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں میں فکری اور علمی آزادی کی گفتگو میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر آزادی کی طرح فکری اور علمی آزادی بھی خود کوئی مقصد نہیں بلکہ مقاصد کے حصول کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ اور

علمی وفکری آزادی کو جہاں تک حقائق کو مسخ کیے بغیر ممکن ہو معاشرے کے معتقدات اور ثقافتی نہج کا احترام کرنا چاہیے۔ ہم ایک قومی ثقافت رکھتے ہیں، چند بنیادی اقدارِ حیات کو مانتے ہیں۔ علمی اور فکری آزادی کو اسی ثقافتی ڈھانچے اور نظامِ (Pattern) میں اپنے لیے جگہ بنانی ہوگی، بنیادی تصوراتِ حیات اور فکری آزادی کا گہرا رشتہ ہے۔ اسلام کی عطا کردہ اقدار ابدی سہی لیکن عہدِ حاضر میں ان کا عملی اطلاق فکری وعلمی آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ علمی آزادی کو علمی سطح تک رہنا چاہیے، اسے سیاسی یا دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا مناسب نہیں۔ ہمارے اپنے معتقدات خواہ کچھ ہوں لیکن ہمیں کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اپنے طلباء کے سامنے پیش کرنا ہوگا اور وہ بھی اس طرح کہ ہمارے لہجے میں اس نقطۂ نظر کے لیے تمسخر نہ ہو جو ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق نہیں ہے۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ علمی آزادی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اپنے ذہن کو نئے خیالات قبول کرنے کے لیے کھلا رکھیں۔ اقبال کے الفاظ میں

چاہیے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

(مذاکرہ جامعہ کراچی۔ ۱۹۶۶ء)

ماضی وحال کے تناظر میں مستقبل کی فکر

آج شام انسانی تاریخ کے ایک عظیم مفکر سقراط کے اس قول نے میرے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا کہ میں صرف یہ بات یقین سے جانتا ہوں کہ ''میں کچھ نہیں جانتا۔''

ہمدرد فاؤنڈیشن نے اس سال اب تک جن صاحبانِ علم وادب کی خدمات کا اعتراف کیا ہے' ان میں مجھے اپنا نام اجنبی سا لگ رہا ہے۔ ہاں مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس اعزاز سے میرے ان دو اساتذہ کو بہت مسرت ہوگی جن کو اس سے پیشتر وثیقۂ اعتراف پیش کر کے اس وثیقے کو اعتبار بخشا جا چکا ہے۔ میری مراد پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں اور پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے ہے۔ میرا یہ اعزاز ایک حیثیت سے میرے اساتذہ کے مرتبۂ علمی کا اعتراف ہے۔

مستقبل کے بارے میں ہم اپنے ماضی اور حال کے تناظر ہی میں سوچ سکتے ہیں۔ ہمارا عظیم ماضی حال کے تناظر میں کسی اور قوم کی روداد معلوم ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے کھویا بہت اور پایا کم ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک قوم نے اپنی شناخت' اپنی ثقافت' اپنے قومی جوہر اور جینیس کے تحفظ کے لیے ایک وطن حاصل کیا۔ آج وہ وطن تو طوفانی سمندر میں ایک کشتی کی طرح موجود ہے' مگر وہ قوم علاقائی اور نسلی تعصبات کے اندھیروں میں گم ہوگئی ہے۔ سب سے وحشت ناک بات یہ ہے کہ ہم احساسِ زیاں سے محروم ہوگئے ہیں۔ اب پاکستان کو ایک قوم کی کُلی بازیافت کے بجائے محض ایک سیاسی اور معاشی مطالبہ قرار دیا جا رہا ہے۔ قائد اعظم نے برعظیم جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو اپنے ممیز کلچر اور تہذیب' زبان اور ادب' فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر' اسماء الرجال' اقدار و تناسب کے احساس' قانون' ضابطۂ اخلاق' رسم و رواج' تقویم' تاریخ اور روایات' مقاصد اور رجحانات اور زندگی کے بارے میں ایک جداگانہ نقطۂ نظر

کی بنا پر ایک علاحدہ قوم قرار دیا تھا۔ ملاحظہ ہو گاندھی جی کے نام قائد اعظم کا ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء کا خط

``We are a nation with.our distinctive culture, and civlization, language and literature, art and architecture, name and nomenclature, sense of value and proportion, legal laws and moral codes, customs and calender, hisrory and traditions, aptitudes and ambitions. In short we have our own distinctive outlook on life and of life.``

(Speeches amd writings of Mr, Jinnah (volume II), edited by Jamiluddin Ahmad, p.102, Sh. Mahammad Ashraf. 1964)

اب ''مسلم آئیڈولوجی'' کو ایک نئی اصطلاح قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ حال آنکہ خود قائد اعظم نے یہ اصطلاح استعمال کی تھی۔ انہوں نے سرحد مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام ۱۸ جون ۱۹۴۵ء کو اپنے پیغام میں لکھا:

``pakistan not only means freedom and independence but the Muslim ideology which has to be preserved, which, has come to us as a precius gift and treasure and which we hope, others will share with us`` (Ibid p.175)

(پاکستان کا مطلب صرف آزادی نہیں ہے بلکہ مسلم آئیڈولوجی ہے جس کا ہمیں تحفظ کرنا ہے اور جو ہم تک ایک قیمتی خزانے اور تحفے کے طور پر پہنچی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرے بھی ہمارے ساتھ اس کا فیض حاصل کریں گے۔)

لیکن ہم اپنی ہجری تقویم اور تاریخ سے اتنے الرجک ہیں کہ آج بھی اپنا یوم آزادی ۲۷ رمضان المبارک کو منانے کے بجائے ۱۴ اگست کو مناتے ہیں۔ اللہ نے سورج اور چاند کو وقت کا پیمانہ بنایا ہے۔ ہم میں سے کوئی شمسی تقویم کے خلاف نہیں، لیکن مسئلہ اپنی تقویم کو اختیار کرنے اور اُسے معتبر بنانے کا ہے۔

ہم اور ہمارے نوجوانوں نے ایک نئی صدی کی آمد کو دیکھا اور دوسری نئی صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ آج سے بارہ سال پہلے پندرھویں صدی ہجری کی آمد پر دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح پاکستان نے بھی چند جلسے اور کانفرنسیں منعقد کیں اور پھر ایران اور عراق کی جنگ نے پندرھویں صدی ہجری کے طلوع کو داغ دار کر دیا۔ کویت پر عراق کی لشکرکشی کے نتیجے میں مغربی سامراج اور امریکا کے فوجیوں کے قدم ہماری ارض مقدس کی چوکھٹ تک پہنچ گئے۔ آج عالم اسلام پر نظر ڈالیے تو جہالت اور غربت کے ساتھ ساتھ شخصی حکومتوں اور آمرانہ نظام کا تسلط نظر آئے گا۔ دوسری طرف ترقی یافتہ اور صنعتی اقوام کے نزدیک کرۂ ارض کی بقا اور انسان کے صحت مند وجود سے زیادہ اہم اپنی ترقی کے معیار ہیں۔ جوہری بم سے انسانوں کو فوراً ہلاک کر دینا یا زہریلی گیسوں اور ماحول کی آلودگی کے ذریعے سے تبدریج ہلاک کرنا۔ کون سا فعل زیادہ ظالمانہ ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کریں۔ امریکا برازیل کی بقائے ارض سربراہ کانفرنس میں معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار پر ابھی تک قائم ہے۔

مجھے یہ مسئلہ اس لیے چھیڑنا پڑا کہ آج کوئی قوم عالمی حالات کو نظرانداز کر کے اپنے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔ مسئلہ اکیسویں صدی میں محض ہماری ترقی کا نہیں، بلکہ انسان اور کرۂ ارض کی بقا کا ہے۔

وطن عزیز میں آج صورت حال یہ ہے کہ انسانی لاشوں پر سیاست کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ ہماری ترجیحات کی فہرست بالکل الٹی ہے۔ ہمارا، بلکہ ساری انسانیت کا مسئلہ انسان سازی ہے اور ہم اسی کو بھول چکے ہیں۔ پاکستان شاید واحد ملک ہے جس کے دانش ور، صحافی اور تعلیم

کرنے والوں کے علم اور جذبات کا آئینہ ہوتی ہیں۔ اگر اکیسویں صدی میں ہمیں اپنی ترقی کرنی ہے تو اپنی زبانوں کے علمی سرمائے کو دوسری عالمی زبانوں کی سطح پر لانا ہوگا۔ کیا اردو میں کوئی معیاری قاموسِ علوم (انسائی کلوپیڈیا) ہے؟ کیا برعظیم کے مسلم عہدِ سلطنت اور عہدِ مغلیہ کے فنِ تعمیر، خطاطی اور دوسرے فنون پر ایسی کتابیں ہماری زبان میں ہیں جنہیں ہم معیاری کہہ سکیں؟

ہم کب تک ایک ترجمہ کرنے والی قوم بنے رہیں گے۔ ہماری قومی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے جو ادارہ قائم کیا گیا ہے اس کا نام بھی انگریزی سے ترجمہ ہے یعنی مقتدرہ قومی زبان (National Language Authority)۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے بارے میں سید محمد جعفری مرحوم کا یہ شعر تو آپ کو یاد ہوگا۔

یہ زباں دانوں کی محفل، ہیں سبھی جس میں ادیب
نام تک ہو نہ سکا اپنی زبانوں میں نصیب

اکیسویں صدی کا استقبال کرنے کے لیے ہمارے اساتذہ پر آج سے یہ لازم ہے کہ وہ تمام علوم کی بنیادی کتابوں کو سامنے رکھ کر اور ان میں اپنے علم اور ذات کو شامل کر کے اپنی تالیفات پیش کریں۔ یہ کتابیں ہی فکر و نظر کی اساس بن سکیں گی جن کی روشنی میں ہم اکیسویں صدی میں اپنے سفر کا آغاز کر سکیں گے۔

اب اپنے وجود کی بنیاد یعنی اسلام کے حوالے سے مختصراً ایک دو باتیں کہتا ہوں۔ بدقسمتی سے ہم انسانی ترقی کے سفر میں اپنے مرتبے، مقام اور کردار کو بھی بھول چکے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے چند لفظوں میں ہمارے رول اور انسانی تاریخ میں ہمارے مرتبے کا تعین کر دیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ؕ

(سورۃ آل عمران۔۱۱۰)

(اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)

اسی آیتِ کریمہ کی بنیاد پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کہیں لکھا ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انفرادی اور حد درجہ بلند امتیاز ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کے ساتھ ایک قوم بھی مبعوث کی گئی۔ قرآن کے مطابق اللہ کا رسول ﷺ مومنوں پر شاہد ہے اور مومن عالمِ انسانیت پر شہادت ہیں۔

اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیے بغیر یہ منصب بلند ہمارا حق نہیں بن سکتا۔ اسلام میں اللہ کے چنے ہوئے بندوں کا کوئی نسلی تصور نہیں جیسا کہ یہودی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو اکیسویں صدی میں تکریمِ آدم کا پرچم بلند کرنا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے۔

لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ

(سورۃ بنی اسرائیل۔ ۷۰)

(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی۔)

مسلمانوں کو اخوت و مساواتِ آدم کو ایک حقیقت بنانا ہے، کیوں کہ وحدتِ آدم ہی توحیدِ الٰہی کا تکملہ ہے۔

ہر سفر کے لیے مقصد اور سمت کا تعین ناگزیر ہے۔ ہمیں اکیسویں صدی کے لیے اپنی منزل کا تعین قرآنِ کریم اور اسوۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں کرنا ہوگا تا کہ ہم انسانیت کے لیے تازہ ہوا اور انسانوں کے لیے آبِ حیات بن سکیں۔

شامِ ہمدرد، کراچی

۱۱ جون ۱۹۹۲ء

یافتہ لوگ اس کی بقا کے بارے میں شکوک کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ایسی بے یقینی تو برسوں سے خانہ جنگی میں مبتلا ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔ ہر شخص آج کو اپنے لیے زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کا پیمانہ سمجھتا ہے۔ ہمارا حال خود غرضی کا آئینہ خانہ ہے۔ ہم امروز کی تعمیر سے محروم ہیں۔ بعض اشعار اور اقوال کثرتِ استعمال سے اپنی معنویت کھو بیٹھے ہیں، لیکن اقبال کا ایک شعر پیش کیے بغیر شاید میں گفتگو کو آگے نہ بڑھا سکوں۔

وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

اکیسویں صدی کے استقبال کے لیے ضروری ہے کہ ہم حقیقت پسندی کے ساتھ صورتِ حال کا جائزہ لیں۔ عام پاکستانی کو آزادی نے کیا دیا ہے؟ اس کا جواب تھرپارکر کے علاقے سے مانگیے جہاں پینے کا پانی ایک مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ ہماری ساٹھ فی صد آبادی کا ہے۔ اگر ہم اپنی قوت ارادی کے ساتھ تعمیر وطن کے لیے اپنے وقت، صلاحیتوں اور وسائل کا ایک حصہ وقف کریں تو جہالت اور صحت کے مسائل پر آٹھ برسوں میں بڑی حد تک غالب آ سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ہم اسے ہنگامی ضرورت سمجھیں اور ہمارا رویہ ایسا ہو جیسا اپنے بچے کی علالت کے وقت ہوتا ہے۔ شہروں، قصبوں اور چھوٹی بستیوں میں مدرسہ اسکولوں کا جال بچھا دیں۔

ایک بات اور عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔ وہ یہ کہ خواندگی کی ضرورت مسلّم، مگر ابلاغِ علم کے اور بھی وسیلے ہیں جیسے محفلیں، جمعہ کے خطبے، ریڈیو پر بنیادی باتوں سے متعلق مربوط اور مسلسل پروگراموں کا سلسلہ۔ ٹیلی ویژن کے ذریعے سے آنکھ کو حرف شناسی کا بدل بنانا۔ منٹگمری واٹ نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ صرف قرآنِ حکیم اور احادیث کی تفہیم کے ذریعے سے عرب کس طرح یونانیوں کے علم کے وارث، نقاد اور علومِ انسانی کو آگے بڑھانے والے بن گئے! ظاہر ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور بہت ہوا، مگر سب صحابہؓ خواندہ نہیں تھے۔ یہ نبوت کا معجزہ تھا جس کا اعادہ ممکن نہیں، لیکن فوری طور پر ناخواندہ

بالغوں کے لیے ہمیں جدید ذرائع ابلاغ کی مدد سے شعور و آگہی کو عام کرنا ہوگا۔

یہ بات عبوری دور کے لیے عرض کر رہا ہوں ورنہ تاریخ کے جس عہد سے ہم گزر رہے ہیں وہ علوم کے نئے آفاق کا دور ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں اب پودوں کی بھی مائیکرو سرجری کی جا رہی ہے، مگر میرے نزدیک اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں انسان کے دل میں مقامِ درد پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ یہ نہ ہو کہ ہماری ترقی میں کوئی توازن نہ ہو۔ آج مریخ تک پہنچنے کے مرحلوں سے گزرنے والا انسان اپنی دنیا کے لوگوں کے احوال کی خبر نہیں رکھتا۔ اقبال نے کتنے پہلے یہ بات کہی تھی۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

آج اپنے تمام علم اور توانائیوں کے ساتھ انسان اپنے اور کائنات کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ مجھے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی نظر، علم اور فکر کے مطابق اس سے آگاہ ہے۔ سائنس کی ترقی نے ایک طرف تو عناصرِ فطرت پر ہماری تسخیر میں اضافہ کیا اور دوسری طرف کائنات کی وسعتوں کی آگاہی کا جو باب ہم پر کھلا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اس وسعتِ بے کراں میں کتنے حقیر ہیں۔

میرے نزدیک اکیسویں صدی کے سب سے بڑے مسئلوں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مسخر کرے اور اپنی تہذیب کرے۔ یہ کام صرف مذہب اور ادب کے وسیلے سے ممکن ہے۔ مذہب اچھے اور قائم رکھنے والے ادب کو آفاقی قدریں عطا کرتا ہے۔ ادب کا وسیلہ زبان ہے، اسی لیے ہم پاکستانیوں کو اپنی قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے علمی ذخیرے کے سلسلے میں سنجیدہ ہونا پڑے گا۔ یہ مسئلہ عصبیت سے حل نہیں ہو سکتا۔ انسان کی ساری ترقی زبان ہی کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے۔ زبان انسان کے لیے اللہ کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ زبان مکمل کلچر نہیں، کلچر کے اور عناصر بھی ہوتے ہیں، لیکن زبان قومی ثقافت کا اشاریہ ہوتی ہے۔ زبانیں علمی طور پر مال دار یا غریب نہیں ہوتیں، بلکہ اپنے بولنے والوں اور استعمال

"سائنس کی مدد سے ستاروں کی گزرگاہوں کو تلاش کرنے والا آدمِ خاکی چاند کی سرزمین پر قدم رکھ چکا ہے اور اب مریخ ہی کی طرف رواں نہیں، بلکہ ان جہانوں کو تلاش کر رہا ہے جو ابھی بے نمود ہیں، لیکن یہی انسان۔ اپنے پڑوسی کی آنکھوں کے آنسوؤں کو نہیں دیکھ پاتا۔

سڑک پر چلتے ہوئے ہمیں لوگوں کے چہروں پر کرب کی لکیریں نظر نہیں آتیں۔

کوئی آگاہ نہیں باطن یک دیگر سے
ہے ہر اک شخص جہاں میں ورقِ ناخواندہ"

——— سیّد محمد ابوالخیر کشفی